ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۱۶ - ۲۳ اگست ۱۹۷۳ء

قیمت: ۵۰ پیسے

براہ ڈاک سے ایک روپیہ



الفتح انکشاف

١٨ کروڑ روپے میں سودا طے ہو گیا

ولیکا، مولا بخش اور ہوتی نے اپنے صنعتی اداروں کو فروخت کر دیا

ولیکا، مولا بخش اور ہوتی نے اپنے بڑے صنعتی ادارے فروخت کر دیے ہیں۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز، ولیکا فیبرکس اور ولیکا وولن ملز کو حاجی ہاشم اور حکمران جماعت کے بعض بااثر شخصیات یا ان کے عزیزوں نے خریدا ہے اور تقریباً ١٨ کروڑ روپے میں سودا طے ہو گیا ہے۔ ولیکا خاندان، ہارون خاندان کے اشتراک سے دوبئی میں سیمنٹ کا کارخانہ قائم کرے گا۔ مولا بخش نے اپنے بحری جہاز فروخت کئے ہیں اور اب سنگاپور میں کاروبار کریں گے۔ ہوتی نے چارسدہ میں کاغذ کا کارخانہ بھی حاجی ہاشم اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔

علاوہ ازیں سرمایہ داروں کی اکثریت اپنی ٹیکسٹائل ملوں کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ کھاروں میں انور ٹیکسٹائل ملز، بخش ٹیکسٹائل ملز اور احمد سپننگ ملز کی سودے بازی ہو رہی ہے ٹیکسٹائل انڈسٹری کے مذکورہ مالکان بھی سنگاپور میں نئی ملیں قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

الفتح کی اطلاعات کے مطابق پاکستان کے اکثر بڑے سرمایہ داروں نے موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد ناجائز ذرائع سے اپنا سرمایہ غیر ممالک میں منتقل کر دیا ہے۔ ان کے خاندان کے گنے چنے افراد ملک میں رہائش پذیر ہیں جبکہ باقی غیر ممالک میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔

> پاکستان کی
> ملوں کو فروخت کر کے
> سنگاپور میں ملیں
> قائم کرنے کا منصوبہ

ایک اور اطلاع یہ ہے کہ اس وقت تقریباً دس ارب روپے کی رقم کا زرِ مبادلہ غیر ملکی بنکوں میں پڑا ہوا ہے جسے حکومت کے دباؤ کے باوجود ملک واپس نہیں لایا گیا۔ اس فہرست میں ایک ریٹائرڈ جنرل بھی شامل ہے۔ سرمایہ داروں کی ہوس اس پر ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے ناجائز ذرائع سے زرِ مبادلہ کی اسمگلنگ ابھی تک جاری رکھی ہے۔

تجارتی حلقوں کی رائے ہے کہ کارخانوں اور اثاثوں کی فروخت کا موجودہ رجحان پاکستان کی رہی سہی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ یہ رقم کبھی نہ کبھی طرح غیر ممالک کے بنکوں میں منتقل ہو جائے گی اور اس کی بدولت پاکستانی سرمایہ دار غیر ممالک میں کاروبار کریں گے۔ خاندانوں سمیت بیرونی ممالک میں سکونت اختیار کرنے سے یہ امید بھی ختم ہو جاتی ہے کہ پاکستانی سرمایہ دار غیر ملکی کاروبار کے ذریعے اپنے ملک کے لئے زرِ مبادلہ کمائیں گے۔

ایک طرف یہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف حکومت زرِ مبادلہ کمانے کے لئے پیاز، گوشت، دالیں اور سبزیاں تک بیرونی ممالک میں برآمد کرنے کی اجازت دے چکی ہے۔ جس کی وجہ سے ان ضروری اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں اور ہر آدمی مہنگائی کے ہاتھوں بلبلا رہا ہے حال ہی میں حکومت نے ان اشیاء کی برآمد بند کر دی ہے مگر اس کے اثرات کافی عرصے تک موجود رہیں گے۔

اس کے علاوہ حکومت نے سرمایہ داروں کو مراعات دینے اور صارفین پر مزید قیمتوں کا بوجھ بڑھانے کی پالیسی اختیار کر لی ہے بناسپتی گھی کے کارخانوں کے مالکان نے منظم اور منصوبہ بندی کے تحت حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ کل پیداوار پر ٹیکس عائد کرنے کا فیصلہ واپس لے اور مقررہ پیداوار پر ٹیکس وصول کرے۔ یعنی جو کارخانے مقررہ حد کے مطابق روزانہ ایک ہزار ٹن بناسپتی گھی تیار کرتے تھے اب وہ روزانہ دو ہزار ٹن پیداوار یا اس سے زائد یا کم بھی کر سکتے ہیں مگر ٹیکس ایک ہزار ٹن پر ہی وصول کیا جائے گا۔ یہ رعایت اس کے علاوہ ملے گی جو قیمتوں میں اضافے کی صورت میں دی گئی ہے اس کا مطلب کہ سرمایہ دار کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی اور عوام کا سر کڑھائی میں ہوگا۔

۱۶-۲۳ اگست ۱۹۷۳ء
قیمت : — ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

مدیر
وہاب صدیقی

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد ۴ — شمارہ ۱۴

اداریہ

کون آوے کون جاوے

چھ سال کے بعد لوگ ایوب خان کی حمایت میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس کی تصویریں فروخت ہو رہی ہیں۔ انہیں ٹیکسیوں اور رکشاؤں کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ باربر سیلونوں میں سجایا جا رہا ہے اور باقاعدہ موضوع کے طور پر ایوب خان کے دور کی خوبیاں اور موجودہ حکومت کی خامیوں پر بحث ہو رہی ہے۔

یادش بخیر، یہی ظالم اور سفاک ایوب خان تھا، یہی وہ آمر تھا جس کے ظلم اور ناانصافیوں سے تنگ آکر پورا پاکستان اٹھ کھڑا تھا خیبر سے چاٹگام تک ایک آواز تھی "لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی، نہیں چلے گی — مانگ رہا ہے ہر انسان روٹی کپڑا اور مکان، روٹی کپڑا سب کو دو، ورنہ گدی چھوڑ دو"

اس طوفان میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو مرکزی کردار کی حیثیت سے ابھرے۔ انہوں نے عوام کی باتیں کیں جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کو للکارا، اعلان کیا کہ کھیت اُس کا جو ہل چلائے، کارخانے محنت کشوں کے اور افسر شاہی عوام کی نوکر۔ کوئی ظلم نہیں رہے گا۔ کوئی بھوکا نہیں مرے گا۔ بیروزگاری نہیں ہو گی۔ سب برابر ہیں۔ سب کے حقوق برابر ہیں۔ خامیوں کو ٹکس اپ کر دیا جائے گا۔

خاص مضامین

سرورق : انور سمیع
عکاس : گرینگو

فون : ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸۰ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

جناب بھٹو عوام کی آواز بن گئے تھے۔ پنجاب کہہ رہا تھا ساڈا بھٹو آوے ای آوے، سندھ اس کا ہمنوا تھا۔ انتخابات ہوئے، جناب بھٹو کی پارٹی جیت گئی۔ لیاری نے ہارون کو چت کر دیا۔ اچھرہ نے جماعت اسلامی کا برج الٹ دیا، مختار رانا نے سہگلوں کے کے طلائی قلعے کے پرخچے اڑا دیئے۔ خورشید حسن میر کے مقابلے میں ایئر مارشل اصغر خان کی ہوائیاں اُڑانے لگیں۔ جہاں جہاں غریب اور مظلوم بستے تھے، وہاں پیپلز پارٹی جیتی، لوگوں نے کفر کے فتووں کو پاؤں تلے مسل ڈالا۔ اور "ساڈا بھٹو آوے ای آوے" کو پورا کر دکھایا۔

لوگوں کا یہ نشہ پیپلز پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد رفتہ رفتہ اترنے لگا۔ نقابیں ہٹیں تو اصل چہرے ظاہر ہوئے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کا طبقاتی کردار سامنے آیا۔ پہلے ہتھیار ڈالنے والی فوجی قیادت سے سمجھوتہ ہوا۔ کہا گیا کہ انہیں بُرا بھلا مت کہو۔ پھر سوشلزم کی جگہ مساواتِ محمدی کی اصطلاح رائج کی گئی، پھر کہا گیا کہ مساواتِ محمدی کا مطلب "ملی جلی معیشت" ہے۔ نجی اور سرکاری شعبے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ لیکن اصل میں نجی کاروبار ہی چلے گا پھر کراچی میں ویت نام کی حمایت میں صحافیوں اور دانش وروں کے جلوس پر بڑی بیدردی سے لاٹھی چارج کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کی نام نہاد سامراج دشمنی کا پردہ بھی چاک ہوا۔

جون ۱۹۷۲ء آیا۔ سائیٹ میں گولی چلائی گئی مزدوروں کی لاشیں گریں۔ بیسیوں زخمی ہوئے اور متعدد گرفتار۔ چار ماہ بعد یہی ڈرامہ بڑے پیمانے پر لانڈھی میں رچایا گیا۔ اب محنت کش اس حکومت کو کیسے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھیں۔

ادھر پرانے رجعت پسند، کنونشن لیگیے اور عوام دشمن عناصر چن چن کر حکومت میں بھرتی کئے جانے لگے، میاں انور علی، نجف خان، میاں بشیر احمد، عزیز احمد، جی احمد، پیر علی راشدی سب کے سب بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ جو ڈبل بیرل خان تھے وہ نئی حکومت کی بڑی توپ بن گئے۔

خود پارٹی نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔ وڈیرے، سامراج دوست عناصر، نوکر شاہی کے پروردے، سرمایہ داروں کے ایجنٹ، چیئرمین کے مقرب بنے اور معراج جیسے جیالے عوام دوست "جانشین" پارٹی اور حکومت سے الگ کر دیئے گئے۔

ادھر شیخ چلیوں کے انداز میں قومی معیشت کو چلایا گیا، ضرورت سے زیادہ سکّہ کی قیمت میں کمی کر دی گئی، پاکستانی روپیہ امریکی ڈالر کے نظام سے منسلک کر دیا گیا، اعلان ہوا کہ جو چند صنعتیں، حکومت نے اپنی تحویل میں لے لی ہیں، اُن کے بعد مزید کسی اور صنعت کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا، صنعت کاروں اور تاجروں کے حوصلے بلند ہوئے، مزدوروں کی چھانٹیاں شروع ہوئیں۔ قیمتیں چڑھنا شروع ہوئیں، اسمگلنگ، چور بازاری اور منافع خوری کو فروغ ہوا۔ وزیر وزراء دھمکیاں ہی دیتے رہے کہ ہم اسمگلروں اور منافع خوروں کو گولی مار دیں گے، کھال کھینچ لیں گے، ان کا تو بال بھی بیکا نہ ہوا، عوام کی کھال ضرور اُتار لی گئی۔

اب چاروں طرف ہاہا کار مچی ہے، مزدور، کسان، متوسط طبقہ کے افراد اور ملازمت پیشہ لوگ کہتے ہیں، گزر کیسے ہو۔ ایوب خان کے زمانے میں اتنی مہنگائی کہاں تھی۔ ہر چیز ملتی تھی۔

(باقی صفحہ ۸ پر ملاحظہ فرمائیں)



وزرائے سیلاب کی تباہ کاریوں کو عوام سے چھپاتے رہے

سیلاب کو باعثِ رحمت کہنا

عوام کے ساتھ سنگین مذاق ہے

روم

جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا" کی تاریخی کہاوت پاکستان کے موجودہ حکمرانوں پر صادق آتی ہے۔ سندھ اور پنجاب سیلاب کی زد میں ہیں۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا شدید ترین سیلاب ہے۔ لاکھوں گھر بہہ گئے ہیں۔ لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے ہیں۔ وہ فاقے کر رہے ہیں۔ کھیتوں میں کھڑی فصلیں اجڑ گئی ہیں۔ کھلیان تباہ ہو گئے ہیں۔ مواصلاتی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ لیکن اسلام آباد کے در و بام غیر معمولی طور پر مہر بہ لب ہیں۔ حکمران جشنِ آئین کی تیاریوں میں مصروف ہیں، لاکھوں روپیہ محض اس پر صرف کیا جا رہا ہے کہ ملک میں مستقل آئین نافذ ہونے والا ہے، حکمرانوں کی یہ بے حسی ایک عظیم المیہ ہے اور عوام کے ساتھ سنگین مذاق ہے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ حکومتِ سندھ سیلاب کی تباہ کاریوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور اُسے معمولی واقعہ قرار دے رہی ہے۔ حکومتِ سندھ نے وہی رویہ اختیار کیا ہے جو نومبر ۱۹۷۰ء میں یحییٰ حکومت نے مشرقی پاکستان کے قیامت خیز طوفان کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔ حالانکہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپانے سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ ۳ر اگست کو سندھ کے وزیرِ آب پاشی و بجلی میر اعجاز علی تالپور نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ "سیلاب سے کوئی تشویشناک یا قابلِ ذکر نقصان نہیں ہوا۔ کچے علاقے کے لوگ تو سیلاب کی آمد پر خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کیونکہ اب وہ ربیع کی فصل میں بہت زیادہ گندم کاشت کر سکیں گے۔ اخبارات سیلاب کی تباہ کاریوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔ اور اخبارات کی یہ اطلاعات درست نہیں کہ بعض دیہات اور نشیبی علاقے کی آبادی کا بڑا حصہ سیلاب سے متاثر ہوا ہے۔ حفاظتی بندوں اور پشتوں کی وجہ سے وہ قطعی محفوظ ہیں۔ چنانچہ ایسی صورت میں ان کی منتقلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میر اعجاز علی تالپور کا یہ بیان کتنا بے بنیاد تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسی دن سرکاری ذرائع نے خبر دی کہ نشیبی علاقوں کے متاثرہ افراد کا انخلا شروع ہو چکا ہے۔ اخبارات نے سیلاب کی تباہ کاریوں کی صرف خبریں ہی نہیں شائع کیں بلکہ تصویریں بھی چھاپی ہیں کیمرے کی آنکھ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ وزیرِ آب پاشی کے اِس بیان نے ہمیں ایوبی آمریت کے آخری دور کی یاد دلائی۔ کراچی میں آرام باغ کی مسجد میں پولیس جوتوں سمیت داخل ہو گئی۔ مسجد کی بے حرمتی کی۔ اخبارات نے اس کی تصویر بھی شائع کی لیکن حکومت کی طرف سے جو پریس نوٹ جاری کیا گیا اس میں کہا گیا کہ "پولیس مسجد میں داخل نہیں ہوئی تھی"۔ عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر برسرِ اقتدار آنے والی حکومت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ عوام کو فریب دینے میں فوجی آمروں سے بھی بازی لے جائے۔

۸ر اگست کو سندھ کے وزیرِ اعلیٰ ممتاز علی بھٹو نے بھی ایک پریس کانفرنس میں میر اعجاز علی تالپور کی تان میں تان ملائی اور فرمایا کہ اخبارات کی خبریں غلط ہیں۔ سیلاب کے متعلق چیخ و پکار کا جواز اس وقت پیدا ہوتا جب ان حفاظتی بندوں میں شگاف پڑ جاتے یا انہیں نقصان پہنچے۔ وزیرِ اعلیٰ نے یہ بھی کہا کہ "یہ سیلاب کچے علاقوں کے لئے رحمت ہیں۔ ربیع کی فصل بہت عمدہ ہو گی"۔ اگر وزیرِ اعلیٰ کا یہ بیان تسلیم کر لیا جائے تو سرکاری خبر رساں ایجنسی اے۔ پی۔ پی کی یہ خبر اور تصویر غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ "مٹیارو کے پاس حفاظتی بند میں شگاف پڑ گیا ہے اور سدا بہار ضلع دادو میں سیلاب کا پانی حفاظتی بند کو اپنے ہمراہ بہا کر لے گیا وزیرِ اعلیٰ کا بیان، اے پی پی کی یہ خبر اور تصویر ایک ساتھ ہی اخبارات میں شائع ہوئیں۔

صوبائی وزیرِ آب پاشی اور وزیرِ اعلیٰ کا یہ بیان کہ کچے علاقوں کے لوگوں نے سیلاب کی آمد پر خدا کا شکر ادا کیا اور یہ

حکومت اِس ہاتھ دیتی ہے، اُس ہاتھ سے لیتی ہے



دریائے سندھ میں سیلاب سے متاثرہ افراد اپنے مویشی محفوظ مقامات کی جانب لے جا رہے ہیں

سیلاب ان کے لئے باعث رحمت ہے، کچے علاقوں کے عوام کے ساتھ سنگین مذاق ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار وڈیرہ شاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں علم نہیں، کہ ایک ہاری اور کاشت کار کی کل کائنات ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا اور ایک ہل ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کی پوری زندگی کا مال و متاع اور حاصل ہوتی ہیں۔ اگر یہ بہہ جائیں۔ تو وہ اپنی باقی عمر صرف کرنے کے باوجود ان چیزوں کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا۔ سیلاب میں لوگوں پر جو کچھ بیت رہی ہے وہ متاثرہ افراد ہی بہتر جانتے ہیں۔ بنگلوں میں رہنے والے اور ہاریوں کا خون چوسنے والے ان کا درد محسوس نہیں کر سکتے۔ اگر ان کے بنگلے بھی سیلاب کی زد میں آجاتے تو ہم پوچھتے کہ سیلاب باعث رحمت یا زحمت۔

پنجاب میں سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں فوج طلب کر لی گئی ہے۔ یہ فوجی ہنگامی حالات میں واحد قوت ہوتے ہیں جو صرف ایک اشارے پر امدادی کاموں کیلئے چوکس اور تیار ہو جاتے ہیں، برطانیہ کی کانوں کے دھماکوں میں، فلوریڈا کے ساحل پر آنے والے طوفان میں ترکی اور ایران کے تباہ کن زلزلے میں اور حتیٰ کہ کومیلا میں آنے والے ایک طوفان میں جس میں صرف ۲۹ افراد ہلاک ہوئے تھے، فوج کو طلب کر لیا گیا۔ اور فوج کے جوانوں نے اس داخلی محاذ پر اپنی تربیت کا بہترین مظاہرہ کیا۔ حکومت پنجاب نے فوج طلب کر کے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ لیکن حکومت سندھ نے فوج طلب نہیں کی حالانکہ سیلاب کے نتیجے میں فاقہ کشی اور بے سروسامانی کا شکار ہونے والے لاکھوں نیم جاں افراد کی حالت زار یہ تقاضہ کرتی ہے کہ مسلح فوج کے جوان امدادی کام کے لئے سیلاب کی تباہ کاریوں کی سرحد پر ڈٹ جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ حکومت سندھ فوج کی امداد طلب کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح ہے اور حکومت سندھ کی ہچکچاہٹ بھی درست ہے۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ اسی حکومت نے ، رجون کی فائرنگ کے بعد ملیشیا طلب کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ لسانی جھگڑے اور آزادی صحافت کے مسئلہ پر فوج طلب کرنے کا جواز تھا۔

لیکن حالیہ المیہ جس میں فقط "چند ہزار" خاندان بے گھر ہوئے اور چند لاکھ نیم جاں ہیں۔ صوبائی حکومت کے پاس ہچکچاہٹ کا جواز موجود ہے۔ کاش صوبائی حکومت سیلاب کی شدت کو محسوس کرتی، جو فطرت کے خونیں ہاتھوں نے عوام کے خلاف چھیڑی ہے، فوج کو طلب کر لیتی تو اتنے افراد بے گھر نہ ہوتے، املاک اور مویشیوں کو اتنا نقصان نہ پہنچتا۔

اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافہ

"روٹی، کپڑا اور مکان" کے نعرے پر برسر اقتدار آنیوالی حکومت نے ۱۰ اگست کو "مژدہ" سنایا کہ گھی، آٹے، چاول اور کھاد کے نرخوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب بناسپتی گھی چار روپے ۷۵ پیسے فی سیر کی بجائے چھ روپے سیر اور راشن کا آٹا ۱۸ روپے ۳۷ پیسے فی من کی بجائے ۲۳ روپے من ملے گا۔ اور ساتھ ہی یہ "خوشخبری" بھی سنائی گئی کہ سات سو روپے ماہانہ تک تنخواہ پانے والے تمام سرکاری ملازمین اور تجارتی و صنعتی اداروں میں کام کرنے والے ملازموں کی تنخواہوں میں یکم اگست ۳۵ روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ وفاقی وزیر خزانہ نے قیمتوں میں اضافے کی وجہ یہ بتائی کہ بین الاقوامی منڈی میں تیزی سے قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

تنخواہوں میں ۳۵ روپے کے اضافے سے عوام پر مہنگائی کا دباؤ کم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اشیائے صرف کے نرخوں میں اضافہ کا تناسب تنخواہوں میں اضافے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ اس سے صرف گھی، چاول اور آٹا ہی مہنگا نہیں ہوگا بلکہ اس کا اثر تمام ضروریات زندگی پر پڑے گا۔ سبزیاں بھی مہنگی ہونگی، اور کپڑا بھی۔ اس وقت بھی سبزیوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ پیاز اور آلو دو روپے سیر ملتے ہیں۔ ایک سال قبل اسی موسم میں پیاز ۲۵ پیسے سیر ملا کرتی تھی۔ آج کل دالیں بھی گوشت کے بھاؤ مل رہی ہیں۔ وزیر خزانہ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ باقی اشیائے صرف کے نرخوں پر کس طرح کنٹرول کریں گے۔ دوسرے وہ ان افراد کے بارے میں بھی خاموش ہیں جن کو یومیہ مزدوری ملتی ہے۔ یومیہ مزدوری کرنے والے بھی پاکستان کے شہری ہیں۔ انہیں بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ ان کی اجرت کے اضافہ کے سلسلے میں وزیر خزانہ کیوں خاموش ہیں۔

یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ وفاقی بجٹ پیش کرتے وقت وزیر خزانہ نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ بجٹ افراطِ زر کی روک تھام کرے گا۔ لیکن قیمتوں میں اضافہ اور تنخواہوں میں اضافے کے بعد افراطِ زر مزید بڑھے گا، کم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ کہنا کہ بین الاقوامی منڈی کے نرخوں میں اضافہ کے باعث ملکی منڈی میں قیمتوں کا اضافہ ناگزیر ہے، درست نہیں ہے، وزیر خزانہ کو چاہیئے کہ وہ اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک میں تنخواہوں کی شرح کیا ہے۔ ہمارے ہاں جتنی تنخواہ ایک گزیٹڈ افسر کو ملتی ہے، اتنی یورپ میں ایک مزدور کی تنخواہ ہے۔ اگر حکومت گھریلو منڈی کے نرخوں کو عالمی منڈی کی سطح پر لانا چاہتی ہے تو اسے چاہیئے کہ

باقی صفحہ ۱۳ پر



بحرِ ہند کا اجارہ دار دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوگا

"ایشیائی اجتماعی تحفظ کا نظام" سیٹو اور سنٹو کا دوسرا نام

گذشتہ

تین چار ماہ سے "ایشیائی اجتماعی تحفظ کے نظام" کے قیام کے لئے سوویت یونین کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ سوویت وزیر اعظم کوسیجن اس سلسلے میں متعدد بیانات دے چکے ہیں۔ ۷ اگست کو ماسکو میں ایرانی وزیر اعظم امیر عباس ہویدا کے اعزاز میں دیئے جانے والے عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے کوسیجن نے کہا "ایشیا میں اجتماعی سلامتی کے نظام کو یقینی بنانے کے لئے سوویت یونین تمام ایشیائی ممالک سے سرگرم تعاون کرنے کو تیار رہے اور اس نظام کی کامیابی ایشیائی ملکوں کی طرف سے اجتماعی کوششوں کی متقاضی ہے"

"ایشیائی اجتماعی تحفظ کا نظام" کا منصوبہ ۱۹۶۹ء میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری برزنیف نے تیار کیا۔ اس کا مقصد عوامی جمہوریہ چین کے گرد حصار قائم کرنا اور ایشیائی عوام کی تحریکاتِ آزادی کو کچلنا ہے۔ جب برزنیف نے اس منصوبہ کا اعلان کیا تو امریکہ کے اخبار "انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون" نے ۲۳ جون ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں اس منصوبہ پر "ماسکو نے ڈلیسٹ سے رجوع کیا ہے" کے عنوان سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "ایشیائی اجتماعی تحفظ کا نظام جان فاسٹر ڈلس کا خاکہ ہے۔ پرانے امریکی منصوبہ حصار کی بازگشت ہے۔ ڈلس کی موت کے دس سال بعد "ایشیائی حصار" کا تصور جس پر اس نے اپنے آخری برسوں کا بیشتر وقت اور محنت صرف کی تھی، یکایک ماسکو میں زندہ ہو گیا ہے"۔ اخبار نے مزید لکھا کہ "ایک ایسے وقت میں جبکہ سیٹو اور سنٹو، جن سے ڈلس چین کو گھیرنے کی توقع کرتا تھا، تقریباً تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ اس وقت کریملن کے حکمرانوں نے ایک نئے ایشیائی تحفظ کے معاہدہ کی سرپرستی کا اعلان کیا ہے، جو کہ اپنے مقصد اور ساخت میں ڈلس کے منصوبے سے بہت مشابہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ واشنگٹن کی بجائے ماسکو اس نظام کے دھرے کی کیل ہوگا"۔ اخبار نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس معاہدے کی بنیاد کئی سال سے رکھی جا رہی ہے کیونکہ یہ پروگرام نکیتا خروشچیف نے شروع کیا تھا۔ یہ پالیسی آج تک جاری ہے۔ ایشیائی تحفظ کے نظام کی کنجی واضح طور پر ہندوستان ہے"۔

اگر ۹ اگست ۷۱ء کو سوویت یونین اور بھارت کے درمیان ہونے والے بیس سالہ "دوستی، امن اور تعاون" کے معاہدے کو "انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون" کے مضمون کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ معاہدہ "ایشیائی اجتماعی تحفظ کے نظام" کے قیام کی جانب ایک قدم تھا۔

متحدہ پاکستان اس نظام کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ کیونکہ پاکستانی عوام چین کے خلاف سوویت یونین کی کسی سازش میں شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ سوویت یونین نے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے بھارت سے فوجی معاہدہ کیا اور مشرقی پاکستان میں بھارت کی مسلح جارحیت کی اعلانیہ حمایت کی۔ دسمبر ۷۱ء کی جنگ شروع ہونے سے قبل ماسکو کے نئے زاروں نے چار ہزار میل لمبی چینی روسی سرحد پر ۱۵ لاکھ فوجی دستے، جو سوویت یونین کی کل فوج کا ایک تہائی حصہ ہیں، سرحد پر متعین کر دیئے۔ یہ فوج آج بھی جدید ترین ہتھیاروں سے لیس سرحد پر کھڑی ہوئی ہے۔ ٹینکوں، آرٹلری اور تدبیری ایٹمی ہتھیاروں کی ایک بھاری تعداد اس فوج کے علاوہ ہے۔ سوویت حکومت نے چین پر اس لئے حملہ نہیں کیا کہ چین نے اپنی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کے لئے ۴۰ ڈویژن فوج سرحد پر لگا دی۔ ماسکو تک مار کرنے والے میزائل سرحد پر نصب کر دیئے اور اس کے علاوہ ۳۰ ڈویژن فوج سیکیانگ میں تیار کھڑی ہے۔ تنہا روس، چین کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ ماسکو کے حکمرانوں نے ایک مرتبہ بھی "ایشیائی اجتماعی تحفظ کے نظام" کے قیام کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔

گذشتہ مئی میں ڈھاکہ میں "تحفظ اور تعاون کے سوال" پر ایک نام نہاد بین الاقوامی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کا اہتمام سوویت حکومت نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں چین کی بڑھتی ہوئی ایٹمی طاقت کا جائزہ لیا گیا۔ تاس نیوز ایجنسی کے مطابق سوویت منگولیا کے نمائندے نے "چین کے تجرباتی ایٹمی دھماکوں پر سخت تشویش کا اظہار کیا"۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ منگولیا کے نمائندے نے دو عالمی طاقتوں، امریکہ اور روس کی ایٹمی دوڑ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کانفرنس کے اعلامیہ میں کہا گیا کہ "ایشیائی تحفظ کا نظام" اس بات کا متقاضی ہے کہ ایٹمی طاقت کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔ علاقائی سالمیت کا احترام کیا جائے اور کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے وغیرہ"۔ سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں کے منہ سے یہ بات کوئی اچھی نہیں لگتی۔ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ وہ کون سا ملک ہے، جس نے پاکستان پر بھارتی جارحیت کی حمایت کی، کس ملک نے بھارت کو فوجی اور معاشی امداد دی، کس ملک کے فوجی ماہرین کی نگرانی بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کیا، کس ملک نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی؟ اس کا جواب ایک ہی ہے "سوویت یونین"۔

دراصل سوویت یونین بحرِ ہند پر اجارہ داری قائم کرنے کے لئے ایشیائی اجتماعی تحفظ کے نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ بحرِ ہند اس وقت دو عالمی طاقتوں کی کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ امریکہ بھی اس کے پانیوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ جس ملک کی اجارہ داری بحرِ ہند پر قائم ہو گئی، وہ سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔ چنانچہ "یو ایس ملٹری

ریڈیو" لکھتا ہے "وہ جس ملک نے دنیا کے اس نئے مرکز پر اپنا اثر ورسوخ اور کنٹرول قائم کرلیا، وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوگا۔" سوویت یونین کے حکمران دنیا کی سب سے بڑی طاقت بننے کے لئے "ایشیائی اجتماعی" نظم کے نظام کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔

کمبوڈیا

امریکہ بمباری کے خاتمہ کے بعد بھی لون نول کو فوجی امداد دیتا رہے گا!

کمبوڈیا

کی جنگ آزادی اپنے آخری مرحلہ میں داخل ہوچکی ہے۔ ۵ راگست کو پرنس سہانوک کی سپاہ آزادی کے کئی دستے دارالحکومت نوم پنہہ میں داخل ہوگئے۔ باقی فوج نے پورے شہر کو اپنے محاصرہ میں لے رکھا ہے امریکی طیاروں کی بمباری کے باوجود حریت پسندوں نے دارالحکومت کا رابطہ باقی دنیا سے کاٹ دیا اور ہوائی اڈہ بند کردیا۔ نیوچائنا نیوز ایجنسی کے مطابق جنرل لون نول کی پٹھو حکومت شہریوں کو جبری طور پر فوج میں بھرتی کررہی ہے۔ لیکن اسے عوام کی جانب سے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ نوجوانوں کی اکثریت فرار ہوکر سپاہ آزادی میں شامل ہورہی ہے۔ نوم پنہہ کے عوام لون نول حکومت کی پالیسیوں سے نالاں ہیں۔ ایک بینک کے نوجوان ملازم نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ "بڑی طاقتوں نے ہمیں ایک دوسرے کے خلاف لڑنے پر مجبور کردیا ہے عوام سپاہ آزادی کے خلاف لڑنا نہیں چاہتے۔"

سیاسی مبصرین کے مطابق پٹھو فوج کے حوصلے پست ہیں۔ اُن کے دفاعی مورچے کمزور پڑ گئے ہیں اور اب وہ صرف مزاحمت کررہے ہیں۔ البتہ امریکی بی۔۵۲ بمبار طیاروں کو دیکھ کر ان کے حوصلے بلند ہوجاتے ہیں۔ امریکہ نے ۱۵ راگست سے بمباری بند کرنے کا اعلان کردیا ہے اس اعلان کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ سقوطِ نوم پنہہ میں زیادہ دن بھی نہیں لگیں گے۔

امریکہ نے بمباری بند کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ امریکی عوام کمبوڈیا میں جارحیت کے سخت مخالف تھے، وہ ایک عرصہ سے اس کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔ امریکی کانگریس کی اکثریت بھی جارحیت کے خلاف تھی چنانچہ جولائی میں ایک عدالت نے کمبوڈیا میں بمباری بند کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد یہ مسئلہ امریکہ کی سپریم کورٹ میں اٹھایا گیا۔ یہ مقدمہ سپریم کورٹ ۷۴ سالہ جسٹس ولیم۔او۔ ڈگلس کے سامنے پیش کیا گیا۔ ولیم ڈگلس سپریم کورٹ کے آزاد خیال ججوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ "عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ صدر مملکت کو اعلان جنگ کرنے کا اختیار ہے لیکن آئین میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو صدر کو اس کا اختیار دیتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے ۴ راگست کو حکم دیا کہ امریکی حکومت کمبوڈیا میں فوری طور پر بمباری بند کردے۔

حکومتِ امریکہ نے جسٹس ولیم۔ ڈگلس نے فیصلہ کے خلاف اپیل کی ۵ راگست کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھرگڈ مارشل نے ولیم ڈگلس کا فیصلہ منسوخ کردیا اور کہا کہ امریکی حکومت کم از کم اس ہفتے کے آخر تک بمباری جاری رکھ سکتی ہے اور اسی دوران دوسری سماعت ہوگی۔ اس فیصلہ کے بعد سوال اٹھایا گیا کہ کیا سپریم کورٹ آئین کو نظرانداز کرسکتی ہے؟ مبصرین کا کہنا ہے کہ اس مقدمہ کے فیصلہ میں کچھ وقت لگے گا۔ کیونکہ یہ امریکہ کی تاریخ کا ایک اہم مقدمہ ہے جس میں صدر کے اختیارات کو چیلنج کیا گیا ہے۔

امریکی کانگریس نے صدر نکسن سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ کمبوڈیا میں بمباری بند کردیں۔ صدر نکسن نے اس کے جواب میں لکھا کہ "کانگریس نے اپنی خواہش کا اظہار قانون کی شکل میں کیا ہے، اس لئے انتظامیہ قانون کے سامنے جھکے گی۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ کمبوڈیا میں بمباری ۱۴ راگست کی نصف شب سے بند کردی جائے۔" نیوزویک کے مطابق نکسن کے اس خط کا لب ولہجہ خاصا ترش اور طنزیہ تھا۔

صدر نکسن نے کمبوڈیا میں بمباری بند کرنے کا فیصلہ کانگریس اور رائے عامہ کے دباؤ میں آکر کیا ہے۔ اس لئے وہ لون نول ٹولے کو بھرپور فوجی امداد دیتے رہیں گے، اور ۱۵ راگست کو انہوں نے اس کا اظہار بھی کردیا۔ انہوں نے ایوان نمائندگان کے اسپیکر کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا کہ "امریکی کانگریس کی مرضی کے مطابق ۱۵ راگست کو کمبوڈیا میں بمباری بند کردے گا۔ لیکن کمبوڈیا کی موجودہ حکومت کو بدستور امداد فراہم کرتا رہیگا۔" نکسن کے اس خط کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بمباری بند ہونے کے باوجود کمبوڈیا میں جنگ کے شعلوں بھڑکتے رہیں گے

بقیہ اداریہ

آخر میں شکر کی قلت ہوئی تو بحران آگیا اور ایوب حکومت کو اپنے ساتھ اڑا لے گیا۔ عوام سیدھے ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض اوقات انہیں یہ خیال آتا ہے کہ چونکہ آج کے حالات پہلے سے زیادہ خراب ہیں اس لئے شاید گزرے دور کے حکمران ہی اچھے تھے۔ یہ تو خیر چند باتیں محض ہیں۔ کیونکہ ایوب خان اور اس کا دور بعد کی بیشتر خرابیوں کا سرچشمہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں سیاست میں فوج کا عمل دخل اسی کے دور سے شروع ہوا۔ انہی نے بھٹو صاحب کو بھی اپنی حکومت میں وزیر بنایا اور عوام سے روشناس کرایا۔ انہی نے اپنے بنائے ہوئے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار ایک بار پھر فوج اور یحیٰی خان کے حوالے کردیا۔ وہی یحیٰی فوجی ٹولہ جس نے مشرقی پاکستان میں فوج کشی کی۔ اور پھر جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

اب صورتِ حال بڑی گمبھیر ہے۔ ایک طرف پیپلز پارٹی کی حکومت پر سے عوام کا اعتبار اٹھ چکا ہے یا اٹھتا جارہا ہے دوسری طرف ان کے سامنے کوئی بہتر متبادل راستہ بھی نہیں۔ پیپلز پارٹی جائے تو پھر کون آئے۔ کیا اصغر خاں اور ان کی تحریکِ استقلال جن کی سیاست کے اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں؟ یا یو ڈی الف جو بھان متی کا کنبہ ہے؟

ہمارے نزدیک صرف مزدور طبقہ اور محنت کش عوام کی اپنی انقلابی جماعت ہی بتدریج انہیں استحصالی سیاست کی غلام گردش سے نکال سکتی ہے لیکن انقلابی جماعت صحیح معنوں میں انقلابی جماعت ہونی چاہیئے۔ محض نام کی نہیں ہونی چاہیئے۔

مزدور کسان پارٹی کے صدر اسحاق محمد سے وہاب صدیقی کی ملاقات

ہم اپنی پارٹی کے دروازے ہر خاص و عام پر نہیں کھول سکتے



اصغر خاں پنجابی فلموں کے ہیرو کی طرح بڑھکیں مارتے ہیں

ملکی سیاست پر دائیں بازو کا چھانا، اور بائیں بازو کا مفلوج ہونا ایک عظیم المیہ

حالات بڑے سنگین ہیں۔ قوم میں ابھی عدم اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کا زخم تازہ ہے۔ اور اس کی صدائے بازگشت بار بار سنی جاتی ہے کہ یہاں مشرقی پاکستان بن جائے گا، وہاں مشرقی پاکستان بن جائے گا، قوم میں عدم اعتماد کی وجہ اس خطہ میں سوویت یونین کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ ہے۔ سوویت یونین جس نے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے آخری وار میں بھرپور حصہ لیا۔ اس کا اثر و رسوخ ہمارے علاقے میں ۱۹۷۱ء سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ عراق، اس کا فوجی اتحادی بن چکا ہے، افغانستان کے فوجی انقلاب کے بارے میں بھی کہا جا رہا ہے کہ ماوہ ماسکو نواز ہے۔ بھارت کو سوویت اسلحہ کی ترسیل بڑھ گئی ہے۔ بحر ہند میں کارروائیوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ کوسیجن کے یہ الفاظ "اگر برصغیر میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ تو سوویت یونین وہی کردار ادا کرے گا جو اُس نے ۱۹۷۱ء میں کیا۔" لوگوں کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔"

ان خیالات کا اظہار مزدور کسان پارٹی کے صدر اسحاق محمد نے ایک ملاقات میں کیا، وہ پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتِ حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا "جن حالات نے ۱۹۷۱ء کے المیہ کو جنم دیا، وہ جوں کے توں موجود ہیں۔ سامراجی تسلط کم ہوا نہ جاگیرداری استبداد، نہ سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ ختم ہوئی اور نہ افسر شاہی کی فرعونیت، ان سب کا "دین" جوں کا توں کار فرما ہے، بلکہ ملک میں امریکی سامراج، اس کے علاقائی کارداروں، شاہ ایران اور عرب شیوخ کا اثر و رسوخ پہلے سے دوچند ہو گیا ہے۔ سامراجی سرمایہ داروں کی ایما پر ہماری کرنسی کی قیمت مقرر کی جاتی ہے ان کی فرمائش پر مزدوروں کے قتلِ عام کئے جاتے ہیں تاکہ بقول ان کے صنعتی تعلقات میں "امن" "اطمینان اور بھائی چارے" کی فضا قائم ہو۔ اور نئی سرمایہ کاری کے لئے اعتماد کا ماحول پیدا کیا جا سکے، ملک کے تمام حکومتی اور معاشرتی شعبوں پر جاگیرداروں کا جتنا اثر و رسوخ آج ہے۔ اتنا پہلے کبھی نہ تھا ایران کے سفید انقلاب کا نقشہ سامنے آ رہا ہے اور ایک باجگزار شہنشاہیت جنم لیتی معلوم ہوتی ہے۔ مانگے تانگے کے پیسوں پر ذاتی افواج تیار کی جا رہی ہے۔ پولیس کو مضبوط کیا جا رہا ہے اور اس کی امداد کے لئے غنڈوں کو وردیاں دی جا رہی ہیں۔ سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کی کوئی حد مقرر نہیں، نقلی مہنگائی پیدا کی گئی ہے۔ تاکہ سرمایہ داروں کو مشرقی پاکستان کی مارکیٹ چھین جانے کا معاوضہ دیا جائے۔ حکومت میں ایوب شاہی کے وقت کے افسران عود کر آتے جا رہے ہیں۔"

مسٹر اسحاق محمد نے عوام میں عدم اعتماد کی وجہ یہ بتائی کہ "پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے منشور، پروگرام اور اس کی روح سے بیزاری کا اظہار کر دیا ہے۔ اور اس کی حکومت، ان ہی طبقوں پر اعتماد کرنے لگی ہے۔ جن کے خلاف عوام نے ۱۹۶۸-۷۰ء میں اس کے جھنڈے تلے جہاد کیا تھا۔" انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "استحصالی طبقوں کے افراد نے عوامی ابھار کے دنوں میں بے یقینی اور عدمِ استحکام کی دوزخ کا تجربہ کیا۔ اس لئے اب وہ پیپلز پارٹی کے زیرِ سایہ عوام کی سرکوبی کے لئے زیادہ بے تاب فعال اور شقی القلب

قوم ابھی تک عدم اعتماد کی شکار ہے

جنوبی ایشیا میں سوویت یونین کا اثر دوچند ہو گیا

ہو گئے ہیں۔ کیونکہ بھٹو صاحب کے بغیر ان کی ایسی ہے کہ جیسے کسی آدمی کا سر بے کار ہو جائے۔ ان لوگوں کی پہلی غلطی تو یہ تھی کہ وہ بھٹو صاحب کی قیادت پر یقین لے آئے۔ اور اس سلسلے میں بہت لغو سے کام لیا۔ اور جب وہ خود بھٹو صاحب کی زد میں آئے تو اپنی غلطی کا اعتراف کرنے، عوام کی طرف رجوع کرنے اور عوام کی قیادت قبول کرنے کی بجائے اپنا پورا زور بھٹو صاحب کی مخالفت پر صرف کر رہے ہیں۔ تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ صحیح تھے۔ بھٹو صاحب بھی صحیح تھے لیکن اب بھٹو نے غداری کی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل عوام جو بائیں بازو کی جو تھوڑی بہت قیادت میسر تھی۔ اب وہ بھی ناپید ہے۔"

جناب اسحٰق محمد نے کہا کہ "ہماری سیاست میں حال ہی میں جو سب سے بڑا المیہ رونما ہوا، وہ بائیں بازو کی قیادت مفلوج ہو جانا، اور انتہائی دائیں بازو کی قیادت کا ملکی سیاست پر چھا جانا ہے۔ چنانچہ حکومت اور حزبِ اختلاف میں دائیں بازو ہی کے افراد ہیں۔ حزبِ اختلاف کو صدر بھٹو سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ انہوں نے طبقاتی لحاظ سے ان کا جاتی ہونے کے باوجود عوام کو ان کے خلاف اُبھارا۔ یہ لوگ صدر بھٹو سے گالی گلوچ بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہر ماہ دو ماہ کے بعد سمجھوتہ بھی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو مارشل لاء کی توثیق اور اس کی معیاد میں اضافے پر سمجھوتہ کیا، ۲۱ اپریل کو صدر بھٹو پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ ۲۴ جون ۱۹۷۲ء کو گورنروں نے مفاہمت کے میثاق کا اعلان کیا، جس کے سائے تلے ۷ جون کو سائٹ میں مزدوروں کا قتلِ عام کیا گیا۔ ۱۸ اکتوبر کو پولیس نے بلڈوزروں کی مدد سے داؤد کاٹن ملز لانڈھی پر حملہ کیا تو اس کے معاوضہ میں حزبِ اختلاف نے ایک آئینی سمجھوتے پر دستخط کئے۔ جس میں وزیر اعظم کو برطرف کرنے کیلئے دو تہائی اکثریت کی شرط تھی۔ اسی طرح ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں خون خرابے کے باوجود حزبِ اختلاف نے نئے دستور کو اس لئے قبول کر لیا کہ آئین میں سے سوشلزم کا لفظ نکال دیا گیا تھا۔ اور پیداواری ذرائع، وسائل دولت کو آئینی تحفظ دیا گیا تھا۔"

دائیں بازو کے سیاست دانوں کی بات چلی تو اصغر خان کا بھی تذکرہ آ گیا۔ ان کے بارے میں مسٹر اسحاق محمد نے کہا کہ "اصغر خاں دائیں بازو کے سیاست دان ہیں۔ جنہوں نے سیاست کو بندر کا تماشہ بنا دیا ہے۔ ان کی کوئی تنظیم ہے نہ پروگرام اور نہ ہی کوئی فلسفہ، پنجابی فلموں کے ہیرو کی طرح بڑھکیں، ہمی بڑھکیں مارتے ہیں۔"

مسٹر اسحاق نے بائیں بازو کے عناصر پر زور دیا کہ وہ حزبِ اقتدار کے خانگی جھگڑوں سے پیدا ہونے والے بحرانوں کی فکر میں دبلے نہ ہوں بلکہ آگے بڑھ کر عوام کی قیادت سنبھالیں جس کے لئے ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ بائیں بازو کے آگے بڑھنے کے لئے حالات بہت مناسب اور سازگار ہیں۔ کیونکہ حکمران طبقوں کے ملکی سیاست پر چھا جانے کے باوجود ان کا بحران بڑھ رہا ہے اور بڑھتا رہے گا۔ اور اس وقت ختم ہو گا جب یہ حکمران طبقے ختم ہوں گے۔"

مسٹر اسحاق محمد کے نزدیک حکمران طبقے کے بحران میں

پاکستان میں ایک باجگزار شہنشاہیت جنم لے رہی ہے!

اضافے کے اسباب یہ ہیں۔

(۱) حکمران طبقے کے سربراہ سامراجی ممالک کا اپنا بحران شدت اختیار کر رہا ہے۔ ہند چینی میں امریکی سامراج کو شکستِ فاش ہو چکی ہے۔ پس ماندہ ممالک میں عوامی انقلاب کی لہریں لحظہ بہ لحظہ اونچی ہو رہی ہیں۔

(۲) امریکہ اور روس میں حلقۂ اثر کے لئے دوڑ دھوپ بڑھ رہی ہے، جس کی وجہ سے حکمران طبقے آپس میں بٹ رہے ہیں۔

(۳) پاکستان کی سرحدوں پر واقع ممالک بھارت افغانستان اور ایران کے سیاسی افق پر طاقتور اور زوردار انقلابی تحریکیں اُبھر رہی ہیں۔

(۴) ملک کے اندر زندگی کی تلخیاں بڑھ رہی ہیں۔ حکومت عوام کے لئے روٹی، ستر پوشی کے لئے کپڑے، سر چھپانے کے لئے جھگی اور بے روزگاروں کے لئے روزگار کا بندوبست کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہے۔

(۵) قومیتوں کے مسئلے کو حل کرنا حکمران طبقوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

(۶) عوام کا شعور بڑھ رہا ہے۔ سوشلزم کے لئے ان کی لگن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ان میں ظلم کے لئے اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکا دینے کی توفیق پیدا ہو رہی ہے۔

جناب اسحاق محمد نے کہا کہ "ان ہی حالات کے پیشِ نظر میرا یہ خیال ہے کہ بائیں بازو کے عناصر کو آگے بڑھ کر اپنے تاریخی فرض ادا کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے حالات بہت سازگار ہیں لیکن ملک میں بائیں بازو کی مؤثر تنظیم اور تحریک نہ ہونے سے وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ بائیں بازو کو مؤثر اور متحرک بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عوام کی بڑھتی ہوئی مشکلات سے نمٹنے کے لئے ان کی مدد کرے۔ مزدوروں کی برطرفیوں، کسانوں کی بے دخلیوں اور تمام غریب طبقوں پر ظلم و ستم کو روکنے کے لئے عملی اقدامات کریں۔ آج یہ ظلم اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے اگرچہ سرمایہ داروں کے اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں اس کا ذکر بہت کم ہو رہا ہے

بلوچستان کا بحران، نیم نوآبادیاتی
نیم جاگیردارانہ معیشت کا نتیجہ ہے

خود ہماری پارٹی بھی حکمرانوں کے عتاب کا شکار ہے۔ ۲۳، ۲۴، ۲۵ جون ۱۹۷۳ء کی درمیانی شب کو مالاکنڈ ایجنسی میں ۴ ہزار ملیشیا مشین گنیں چلاتی رہی۔

ملیشیا نے ہمارے کارکنوں کو پکڑنے کے لئے مسلح کارروائی کی وہشت پھیلانے کے لئے رات بھر ملیشیا مشین گنیں چلاتی رہی۔ ہمارے دفتروں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ہماری پارٹی کے صدر سید نحیف اور دوسرے کارکنوں کے گھروں کو لوٹا گیا اور ان کے اہل و عیال کی بے حرمتی کی گئی۔ آج بھی سو سے زیادہ کسان کارکن حوالات میں بند ہیں۔ اور بعض کے خلاف وارنٹ گرفتاری ہیں۔ کراچی میں بہت سے کارکن ڈی پی آر کے تحت پابند سلاسل ہیں۔ پنجاب میں ایک کارخانے کی مزدور یونین کے تمام عہدے داروں کو صرف اس لئے بیروزگار کیا گیا کہ اُن پر مزدور کسان پارٹی سے متعلق ہونے کا شبہ تھا۔ یہی ظلم بائیں بازو کی دوسری تنظیموں، مزدور انجمنوں اور کسان کارکنوں پہ ہو رہا ہے۔ خود پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کے کارکن زیرِ عتاب ہیں

انہوں نے کہا کہ "بائیں بازو اور خاص کر اس کے دانشوروں کا فرض ہے کہ پاکستان کی تاریخ، جغرافیہ، یہاں کی سیاسی اور ثقافتی زندگی کا تجربہ عوامی انقلاب کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کریں اور قومی زندگی کی ارتقاء کا مکمل فلسفہ تیار کریں بائیں بازو کو ترمیم پسندی چھوڑ دینی چاہیئے اور اپنا سارا زور موچی گیٹ، نشتر پارک اور لیاقت باغ سے دفعہ ۱۴۴ ہٹوانے میں صرف نہیں کرنا چاہیئے بلکہ بائیں بازو کے دائرے عمل میں مزارعین اور اُن کے کھیت، مزدور، کارخانے اور مزدور بستیاں، طلبہ اور تعلیمی ادارے، دانشور اور ذرائع ابلاغ اور ملک کی دوسرے غریب عوام اور اُن کی زندگی کو بھی لایا جائے"

انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بائیں بازو کا سب سے بڑا گروہ پیپلز پارٹی سے متعلق رہا ہے۔ یہ لوگ پہلے حمایت "شاہ" میں لغو کے مرتکب رہے اور اب مخالف "شاہ" میں لغو کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن اس "عظیم کارنامے" میں ان کی تمام تنظیمی، عقلی، جذباتی اور روحانی صلاحیتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور عوام کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔ حریف "شاہ" بننے میں مزا تو بہت ہے۔ لیکن اس سے فائدہ شاہ کو پہنچتا ہے۔ اور عوام گھاٹے میں رہتے ہیں۔ شاہ بہت چالاک ہے۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ بقول غالب ؎

قطع کیجو نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں تو عداوت ہی سہی

مسٹر اسحاق محمد نے کہا کہ ہمیں کسی بہت بڑے تاریخی حادثے سے قطع نظر عوامی اقتدار کے لئے دِنوں اور مہینوں کے حساب سے نہیں بلکہ سالوں اور پشتوں کے حساب سے منصوبہ بندی کرنا چاہیئے۔ یہ ایک طویل اور کٹھن جدوجہد ہے اور اس میں دم کا پختہ ہونا ایک لازمی شرط ہے"

بلوچستان کے موجودہ بحران پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب اسحاق محمد نے کہا کہ "یہ انتہائی رنج اور قلق کی بات ہے کہ بلوچستان میں ہمارے بھائی فوجی بوٹ سے نوازے جا رہے ہیں۔ یہ واقعہ کسی بھی ملک یا قوم کے لئے انتہائی شرم کا باعث ہونا چاہیئے کہ ملک کے اندر فوج کو استعمال کیا جا رہا ہے"

انہوں نے کہا کہ "بلوچستان کا بحران، اُس بحران کا ایک حصہ ہے جس سے ہمارا ملک دوچار ہے۔ اور یہ بحران ہماری نیم نوآبادیاتی، نیم جاگیردارانہ، معیشت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ بلوچستان میں اس کی شدت کا سبب یہ ہے کہ بیسویں صدی تک آنے کے لئے وہاں کی معیشت کو سو یا دو سو سال کی مسافت طے کرنا ہے۔ دنیا آج سوشلزم کے دور سے گذر رہی ہے۔ لیکن بلوچستان میں سرمایہ داری اور جاگیرداری سے بھی قبل کا سردار نظام قائم ہے۔ اس میں توڑ پھوڑ ہونا لازمی ہے۔ میرے خیال میں وہاں اس قسم کے بحران جنم لیتے رہیں گے اور باقی ملک کو اپنی لپیٹ میں لیتے رہیں گے۔

انہوں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "بلوچستان کا موجودہ بحران فی الحال حکمران طبقوں میں اقتدار کی بندر بانٹ تک محدود ہے لیکن اگر یہ زیادہ عرصہ چلتا رہا تو اس میں لازمی طور پر عوامی رنگ آئے گا بہت ممکن ہے کہ اُس صورت میں اس کی نوعیت بدل جائے اور آج کے حکمران متحارب ٹولے متحد ہو کر بلوچ عوام سے نمٹنے کی کوشش کریں۔ میرا خیال ہے کہ بلوچستان کا یہ بحران یقیناً روس اور امریکہ کی باہمی کشمکش کا حصہ بنے گا۔ بلوچستان کا واحد حل عوامی انقلاب ہے اور یہ سارے پاکستان کا مسئلہ ہے۔ ملک بھر کے عوامی کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ متحد ہو کر اس کے لئے جدوجہد کریں"

قومیتوں کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مسٹر اسحاق محمد نے کہا کہ "ہماری پارٹی پاکستان کی سلامتی، قومیتوں اور قومی گروہوں کی مکمل خود مختاری کو لازم و ملزوم سمجھتی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ بلوچستان کی عوامی طاقتیں بھی یہی چاہتی ہیں۔ بلوچستان کے سندھ سے ہزاروں سال پرانے اور گہرے مراسم ہیں۔ آج سندھ میں بلوچستان سے کئی گنا زیادہ بلوچ آباد ہیں۔ پنجاب میں بلوچوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ بلوچوں کی تاریخی نقل و حرکت مغرب سے مشرق کو رہی ہے۔ اس لئے ان کا پاکستان میں رہنے کا جذبہ قدرتی اور فطری ہے۔ اسی طرح سندھ اور پنجاب کا آپس میں موہنجو داڑو اور ہڑپہ کے دنوں سے ہے۔ دونوں کے دریا بھی مشترک ہیں۔ یہی حال پنجاب، سرحد اور کشمیر کا ہے مغربی پاکستان ایک قدرتی وحدت ہے۔ اس پر مشرقی پاکستان کی مثال لاگو نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بلوچستان، سندھ پنجاب یا سرحد کو مکمل خود مختاری نہ دی جائے۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ بلوچستان اور سرحد میں نیپ اور جمعیت کی حکومتوں کی بحالی کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے۔؟ اسحاق محمد صاحب نے کہا "ہماری جماعت، پارلیمانی جماعت نہیں ہے نہ ہی ہمارا کوئی۔ ایم۔ این۔ اے یا ایم پی اے ہے۔ جس کی وجہ سے ہم پارلیمانی جھگڑوں میں پڑیں۔ اس کے علاوہ اب تو نیپ بھی اپنی حکومتوں کی بحالی کا مطالبہ نہیں کر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اکثریت، اقلیت میں بدل دی گئی ہے۔ نیپ کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ پر تنقید کرے۔ کیونکہ خرید و فروخت کے حمام میں وہ بھی ننگے ہیں۔ مفتی محمود کو وزارتِ عالیہ کی رشوت انہوں نے دی۔ کنونشن لیگ کی دو خواتین بیگم محمودہ سلیم اور بیگم کلثوم سیف اللہ کو اپنی پارٹی کا

افغانستان میں عوامی انقلاب سے بچنے کے لئے فوجی انقلاب لایا گیا ؟

ٹکٹ دے کر اسمبلی کی ممبری دلائی۔ بلوچستان میں اپنے انتخابی وعدوں سے ہٹ کر کسانوں سے تشیشک وصول کی اور اس کی وصولی میں انتہائی تشدد سے کام لیا۔ سرحد میں اس کا ریکارڈ اور بھی بدتر ہے۔ اب اس کے وارث نواب بگٹی اور اسلم خٹک ہیں جو اُن ہی کے پرانے حلیف ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ نیپ اپنے گم کردہ عوامی کردار کو دوبارہ حاصل کرنے کی بجائے۔ ان لوگوں کی گود میں جا بیٹھی ہے جو سوشلزم کو کفر سمجھتے ہیں۔ قومیتوں کے مسئلہ کو پاکستان دشمنی قرار دیتے ہیں۔ اور اب بھی دو قومی نظریہ کے حامی ہیں۔ نیپ اب تو نہ گھر کی رہی ہے نہ گھاٹ کی، اس کی کونسی ایسی حیثیت رہ گئی ہے جس کی ہم حمایت کر سکیں۔ البتہ ایک بات مشترک ہے کہ اس کی بھی پٹائی ہو رہی ہے۔ اور ہماری بھی "

انقلاب افغانستان کے بارے میں مسٹر اسحاق محمد کا کہنا ہے کہ "افغانستان میں بادشاہت کا خاتمہ فی زمانہ کوئی عجوبہ نہیں۔ بالکل قدرتی امر ہے۔ اور تاریخی رو کا حصہ ہے لیکن یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیئے کہ آج کل کے پُرپیچ بین الاقوامی حالات میں بادشاہت کا خاتمہ بذاتِ خود ضروری نہیں کہ ایک ترقی پسند اقوام ہو۔ کیونکہ کمبوڈیا اور یونان میں بادشاہوں کا خاتمہ سی آئی اے کی ایما اور امداد سے کیا گیا۔ افغانستان کے موجود انقلاب کے بعض پہلو غور طلب ہیں مثلاً یہ کہ وہاں کا بہت بڑا شاہی خاندان، جو حقیقت میں ایک پورا قبیلہ ہے، عوام کی شدید نفرت کا شکار ہو گیا تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ سردار داؤد خان نے جو شاہ ظاہر شاہ کے عم زاد اور بہنوئی ہیں، شاہی خاندان کی جان و املاک کے تحفظ کے لئے اس فوجی اقدام کی سربراہی قبول کی ہو۔ دوسرے افغانستان میں ترقی پسند طاقتیں بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فوجی اقدام اس خدشہ کے پیش نظر کیا گیا ہو کہ بادشاہت کے رہتے ہوئے عوامی انقلاب آجائے گا۔ اس کے علاوہ امریکہ اور روس کی باہمی کشمکش کا بھی اس انقلاب میں ہاتھ ہے "

سوال تھا کہ اگر افغانستان کا حالیہ انقلاب انقلابی تحریک کو کچلنے اور روکنے کے لئے برپا کیا گیا تو افغانستان کی ترقی پسند طاقتوں نے اس کی حمایت کیوں کی ؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "اس وقت بظاہر یہ انقلاب بادشاہت کیخلاف لایا گیا ہے۔ اس لئے اُسے مذہبی پیشواؤں اور جاگیرداروں کی حمایت ملنا ممکن نہیں، تو دشوار ضرور تھا، اس لئے ترقی پسند طاقتوں کا سہارا لیا گیا۔ لیکن میرے خیال میں یہ صورتحال زیادہ دیر تک نہیں رہے گی۔ تاریخ میں بار بار یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ حکمران طبقہ کا ایک حصہ جب دوسرے حصہ کو اقتدار سے محروم کرتا ہے تو اس کو مظلوم طبقوں کی حمایت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ۱۷۸۹ء میں فرانس نے سرمایہ داروں نے "اخوت، مساوات اور آزادی" کے نعرے لگاتے ہوئے بادشاہ اور اس کے خاندان کے سر کاٹے لیکن چند ہی سالوں کے بعد عوام کو دبانے کے لئے ایک شہنشاہ بنا دیا گیا پاکستان کی مثال سامنے ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی "عوام اور سوشلزم" کے نام پر اقتدار میں آئیں۔ لیکن اقتدار ملتے ہی دشمن ہو گئیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ افغانستان کے یہ "انقلابی" کن طبقوں سے متعلق ہیں ان کی گذشتہ زندگیاں کیسی ہیں۔ اور ان کے طبقاتی ارادے کیا ہیں ؟

پختونستان کے اسٹنٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "افغانستان کے حکمران، پاکستان کے علاقہ میں پختونستان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ افغانستان کے اندر پختونستان کے قیام کی بات کریں گے تو ان کے لئے بہت زیادہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور ان کا حشر ان لوگوں سے بھی بدتر ہو گا، جو مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے نام پر "پنجابستان" قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے، افغانستان میں افغانوں کی آبادی کا تناسب، پاکستان میں پنجابیوں کے تناسب آبادی سے بھی کم ہے۔ شمال میں تاجک اور ازبک آبادی کے علاقے ہیں، کابل اور اس کے مغرب میں ہرات کی جانب فارسی دان ہیں۔ جنوب میں بلوچ اور درمیانی حصہ میں "ہزارے" ہیں اس کے علاوہ افغانستان میں ذرائع آمدورفت دشوار اور پسماندہ ہونے کی وجہ سے مختلف قومیتوں کا اقتصادی اور ثقافتی ملاپ، بہت کم ہے۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ پختونستان کے عوام، پاکستان کے زبردست حامی ہیں۔ میں نے پختون کسانوں میں بہت عرصہ کام کیا ہے اور میرا تجربہ ہے کہ وہ پاکستان سے بہت محبت کرتے ہیں، اور ان کے ذہن میں علیحدگی کا خیال تک نہیں گزرتا۔ یہ "کارِ خیر" سرمایہ داروں کا پریس اور سیاست دان انجام دیتے رہتے ہیں۔ اگر پختونستان کے قیام کا واقعی کوئی خطرہ ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ پاکستان کے اندر قومیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ قومی ثقافت کو اُبھارا جائے۔ قومی زبانوں کو ترقی دی جائے۔ پروان چڑھایا جائے۔ اور انگریزی کو ملک بدر کیا جائے۔ ملک کو صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن کیا جائے تاکہ عوام کو ایک دوسرے سے ملنے، ساتھ کام کرنے، اور ملکی مفادات کا تحفظ کرنے کا موقع ملے "

اس سوال کے جواب میں کہ مزدور کسان پارٹی بائیں بازو کی جماعت ہے۔ اس کی موجودگی میں بائیں بازو کی ایک اور جماعت کی ضرورت کیوں محسوس کی جا رہی ہے۔ کیا آپ کی پارٹی اس خلا کو پر نہیں کر سکتی ؟ مسٹر اسحاق محمد نے کہا کہ "یہ کوئی نئی بات نہیں، سوشلزم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک ملک میں بائیں بازو کی کئی پارٹیاں رہی ہیں۔ اقتدار ملنے کے بعد اگرچہ ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے لیکن اس میں بھی مختلف گروہ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً رہنماؤں اور کارکنوں کا طبقاتی پس منظر اور کردار، حالات کے تجربہ میں حقائق کو ایک دوسرے پر اولیت اور فوقیت دینے پر اختلاف، طریقۂ کار میں اختلاف اس کے علاوہ شخصیات کا بھی جھگڑا ہوتا ہے۔ حوصلہ مندی اور بزدلی کی بھی بات ہوتی ہے۔ سازشی عناصر موجود ہوتے ہیں اور دشمن طبقے بھی توڑ پھوڑ کرتے رہتے ہیں۔ سامراجی اور ان کی ہمنوا حکومتوں کا یہ خاص دھندہ ہے کہ وہ بائیں بازو کی سیاست کو پروان نہ چڑھنے دیں۔ ان حالات میں ہماری پارٹی یہ سمجھتی ہے کہ جمہوری مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے ہم پارٹی کے دروازے ہر کس و ناکس، خاص اور عام پر نہیں کھول سکتے۔ البتہ ہم اس بات کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں بلکہ خواہش مند ہیں کہ محنت کش طبقوں میں کام کرنے والی مختلف پارٹیوں، گروہوں، تنظیموں اور افراد کو ممکن حد تک مل کر کام کرنا چاہیئے۔

بدعنوانی کا شکار ہونیوالے
ایک شخص کی داستان

معظم علی نے
معمولی ملازم کو قربانی کا
بکرا بنادیا

شیخ عزیز

"میں بے گناہ ہوں"
خدارا مجھے گرفتار نہ کرو"

پی پی آئی کے گودام
سے لٹے اینڈ لٹے کا
مسروقہ ٹیپ رول برآمد ہوا

پی پی آئی کے مینجنگ ڈائریکٹر معظم علی پریس سینٹر کے بھی مالک بن گئے تعلق ہاؤس کے ساتھ ہی لاکھوں روپے کی لاگت سے عظیم الشان عمارت کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ عمارت میں سب سے زیادہ توجہ معظم علی کے کمرے پر دی گئی ہے۔ اس ایئر کنڈیشنڈ کمرے کی آرائش پر تقریباً پچیس تیس ہزار روپے خرچ کئے گئے ہیں۔ مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات مولانا کوثر نیازی نے پریس سینٹر کا افتتاح کیا تھا معظم علی کے کمرے کا معائنہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "سرمایہ دار اور مزدور کا فرق باقی ہے" اس مختصر سے جملے کی معنویت اس وقت سمجھ میں آئے گی جب آپ پریس سینٹر کے ان کمروں کو بھی دیکھیں گے جن میں ملازمین کام کرتے ہیں۔

مولانا نے یہ کہہ کر کہ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان فرق باقی ہے۔ ایک تلخ حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ سرمایہ دار ایمانداری اور اپنی محنت سے دولت نہیں کماتا۔ دھاندلی، بدعنوانی، استحصال اور ہیرا پھیری کے ذریعہ اپنی تجوری بھرتا ہے۔ سینکڑوں افراد کا حق مار کر محلات تعمیر کرتا ہے۔ معظم علی نے وہی راستہ اختیار کیا۔ جو دوسرے سرمایہ دار اختیار کرتے ہیں۔ پی پی آئی کے ملازمین کی حق تلفی کر کے اس شخص نے اپنا دامن بھر لیا۔ یہ ایک طویل اور تکلیف دہ کہانی ہے۔ آئیے ایک صاحب مولانا عبدالحکیم الدین کی سنیئے کہ ان کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے۔ اور انہیں کس طرح بدعنوانیوں میں ملوث کر کے قربانی کا بکرا بنایا گیا۔

مولانا پی پی آئی میں رول کٹر تھے۔ یہ ۶۸-۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے۔ ان کی ڈیوٹی پی پی آئی کے گودام میں تھی۔ ان ہی دنوں سی آئی اے کے علم میں یہ بات آئی کہ بعض سرکاری محکموں سے ٹیلی پرنٹر مشین کے پرزہ جات پیپر رول، ٹیپ۔ اور ربن بڑی تیزی سے غائب ہو رہے ہیں، پولیس ان چوریوں کا سراغ لگانے میں مصروف تھی۔

ایک دن اچانک پولیس نے پی پی آئی کے گودام پر چھاپہ مارا۔ اور مبینہ طور پر محکمہ ٹی اینڈ ٹی کا مسروقہ ٹیپ رول برآمد کر لیا۔ پولیس نے چوری کے الزام میں تین افراد کو حراست میں لے لیا۔ گرفتار کئے جانے والوں میں سیدھے سادے مولانا عبدالحکیم الدین، بیدار صدیق اور مسٹر اسحاق شامل تھے۔ چونکہ بیدار صدیق معظم علی کے بھائی اسلم علی کی بیوی کے رشتہ دار تھے، اس لئے انہیں فوری طور پر رہا کرا لیا گیا۔ پی پی آئی کے مینجر اسحاق انتظامیہ کی بہت سی بدعنوانیوں سے واقف تھے۔ اگر انہیں پولیس کی حراست میں چھوڑ دیا جاتا تو بہت سارے راز کے انکشاف کا خطرہ تھا۔ اس لئے انہیں بھی بھاگ دوڑ کر کے چھڑا لیا گیا۔ اب رہ گئے رول کٹر مولانا عبدالحکیم الدین جو سیدھے سادے بھی تھے اور معمولی ملازم بھی، اس لئے ان میں قربانی کا بکرا بننے کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ چنانچہ معظم علی نے جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس کے مطابق مولانا حکیم الدین پر ساری ذمہ داری ڈال دی گئی، مولانا نے انٹروگیشن کے دوران بڑی سختیاں برداشت کیں، بعد میں دوسری بڑی مصیبت ملازمت سے برطرفی کی صورت میں برداشت کرنی پڑی۔ مولانا بال بچے دار آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔ خدا اور رسول کا واسطہ دیا۔ مگر کسی کو ان کے بیان پر یقین نہ آیا۔ بیکاری کے ایام میں مولانا کے گھر میں فاقے پڑے، بیماری کے دوران دوائیں نصیب نہ ہوئیں۔ عدالتی کارروائی میں کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ اس طرح پی پی آئی کی انتظامیہ نے اپنی بلا مولانا کے سر ڈال کر صاف بچ گئی۔ ایک بے گناہ آدمی تباہ ہو گیا پی پی آئی کے بعض قریبی ذرائع نے اس قسم کی چوریوں کے

بارے میں عجیب و غریب انکشافات کیے ہیں۔ پی پی آئی میں عام طور پر کُل وقتی کی بجائے جُز وقتی ملازم رکھے جاتے ہیں۔ اس قسم کے بیشتر ملازمین سرکاری محکموں میں کل وقتی ملازم ہوتے ہیں۔ اس سے پی پی آئی کی انتظامیہ کو دو طرفہ فائدہ ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ جز وقتی ملازمین سے اپنا کام چلاتی ہے اور دوسری طرف سرکاری محکموں میں کام کرنے والے ملازمین کے ذریعے اسے ٹیلی پرنٹر کے پرزہ جات آسانی سے مل جاتے ہیں۔ پی پی آئی میں جز وقتی ملازمین کا بڑا اثر ہے، ان کے سامنے کل وقتی ملازمین کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ چونکہ انتظامیہ اور ان کے درمیان خفیہ کاروبار ہوتا ہے، اس لئے انتظامیہ بھی ان کی باتوں کی زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

انہی حلقوں نے بتایا کہ پی پی آئی میں سرکاری محکموں مثلاً ریلوے اور ٹی اینڈ ٹی سے چرائے ہوئے سامان کی خریداری کا سلسلہ ۱۹۵۸ء سے چل رہا ہے۔

ابھی حال ہی میں لاہور ریلوے سے ٹیپ ٹرانسمیٹر غائب ہو گیا۔ ریلوے پولیس نے چھان بین شروع کی تو معلوم ہوا کہ کراچی ریلوے سے بھی ٹیلی پرنٹر کا کچھ سامان غائب کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کراچی اور لاہور ریلوے کے ایسے کئی ملازمین کے خلاف تحقیقات کی جا رہی ہے۔ جن کے بارے میں یہ امکان ہے کہ وہ کہیں جز وقتی ملازمت بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں کراچی ریلوے کے دو ملازموں کو ایس ایچ او ریلوے پولیس میں پوچھ گچھ کے لئے بلایا گیا ہے۔ اگر پولیس نے ذہانت سے کام لیا اور کسی دباؤ میں نہ آئی تو یقیناً وہ چوری کے ان لامتناہی واقعات کی تہہ تک پہنچ جائے گی۔ اور اس شریف آدمی کے چہرے سے وہ نقاب اتر جائے گا، جس کے اندر بدنما چہرہ چھپا ہوا ہے۔

پی پی آئی کے قریبی ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ جب سے چوری کے ان واقعات کا پتا چلانے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس روز سے پی پی آئی کی انتظامیہ خاصی پریشان ہے۔ پی پی آئی کے گودام سے بہت سارا سامان اِدھر اُدھر منتقل کر دیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے انکشاف کیا ہے (انہوں نے اپنا نام ظاہر کرنے سے منع کر دیا) کہ جس دن لاہور ریلوے کے ٹیپ ٹرانسمیٹر کی چوری کا انکشاف ہوا اس روز معظم علی بھی پریشان تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رات کے تقریباً دو تین بجے ایک صاحب مرسڈیز کار میں پی پی آئی کے گودام میں آئے تھے، اور بہت سارا سامان اپنی کار میں رکھ کر کہیں لے گئے۔ ان صاحب کا خیال ہے کہ راتوں رات کسی ٹرک سے بہت سارا سامان دوسری جگہ لے جایا گیا ہے۔

ان صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ان دنوں اخبارات میں صرف ایک مشین پی پی آئی کی چل رہی ہے۔ بقیہ دو مشینیں اے ایف پی اور اے پی اے خاموش ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چھاپے کے خوف سے ٹیپ ٹرانسمیٹر غائب کر دیئے گئے اور صرف ایک ٹیپ ٹرانسمیٹر سے کام چلایا جا رہا ہے؟

ہم اپنی جانب سے پی پی آئی کی انتظامیہ پر کوئی الزام عائد نہیں کر رہے ہیں، البتہ جن واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کی روشنی میں منصفانہ تحقیقات بہت ضروری ہو گئی ہے۔ اگر تحقیقات سے پی پی آئی کی انتظامیہ پر چوری کے سامان کی خریداری کا الزام درست ثابت ہوتا ہے تو پھر رول کٹر مولانا عبدالحکیم بھی بے گناہ ثابت ہوتے ہیں، جنہیں ناکردہ گناہ کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس ملک میں ایسے بااثر اور متمول لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے ذریعہ اپنی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے گناہوں کا بھاری بوجھ چھوٹے اور غریب لوگوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔

●

سویابین تیل کی درآمد ۶ کروڑ سے بڑھکر ۱۴ کروڑ روپے ہوگئی

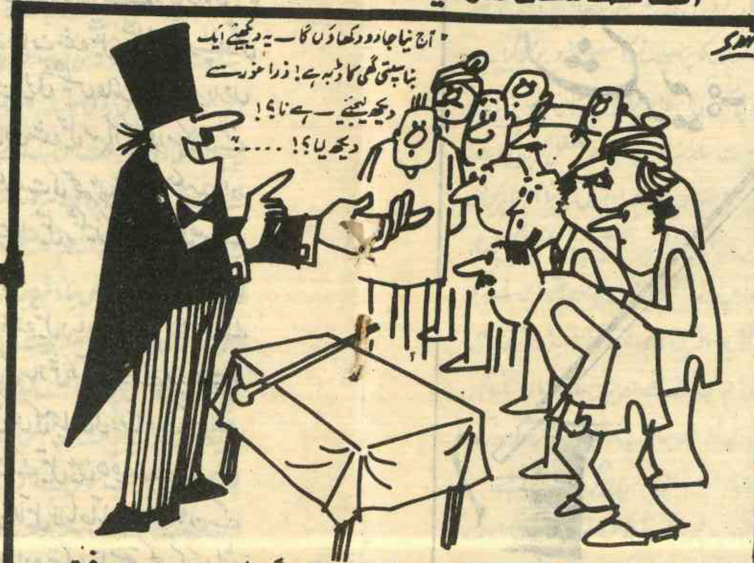
بناسپتی گھی کی مصنوعی قلت کا پردہ چاک

محمد افضل جنجوعہ



ملز مالکان بناسپتی گھی بنانے کی بجائے سویا بین کا تیل مختلف ناموں سے فروخت کر رہے ہیں!

آگ تماشہ ہوا یہ کھیل نہ ہوا...!



بناسپتی گھی پھر بازار سے غائب ہوگیا ——— خبر

ہر کارخانے کے ہائیڈروجن پریشر ٹینک کیوں خراب ہو رہے ہیں؟

آجکل پاکستان کے طول و عرض میں عوام ہاتھوں میں پیالے، دیگچیاں، ڈبے اور کھلے منہ کے برتن لیے گھی کے لئے گداگروں کی مانند مارے مارے پھر رہے ہیں۔ عوام گرانی کے اس دور میں صرف اپنے قیمتی وقت کا بیشتر حصہ ہی ضائع کرنے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ انہیں دھکے بھی کھانے پڑتے ہیں۔ منت، خوشامد، عاجزی اور آہ وزاری سے بھی کام لینا پڑتا ہے اور ایک سیر گھی کی ملنے والی "بھیک" پر انہیں پونے پانچ روپے پلے سے دینے پڑتے ہیں۔ اگر اس ایک سیر گھی کو گھر آکر تولا جائے تو وہ بارہ چھٹانک سے لے کر پندرہ چھٹانک تک تو ہوتا ہے لیکن "اللہ کے فضل" سے سولہ چھٹانک کبھی نہیں ہوا۔

بناسپتی گھی کی صنعت میں بنیادی طور پر نبولے کے تیل کو خام مال کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں کم و بیش ۵ فیصد سویا بین کے تیل کی آمیزش ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ سویا بین کے تیل کی آمیزش سے گھی دانے دار اور دیکھنے میں اصلی گھی کی مانند بن جاتا ہے۔ مونگ پھلی، مکئی اور تلوں کے تیل کو بھی کام میں لایا جاسکتا ہے۔ گھی بنانے کے لئے خام مال میں تیس فیصد کی نسبت سے سرسوں، توریا اور رائی وغیرہ کے تیل کی ملاوٹ کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ہمارے "دیانتدار اور عوام دوست" صنعت کار اس گنجائش سے کافی حد تک مستفیض ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بناسپتی گھی پگھلی ہوئی چربی دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی رنگت بھی سیاہی مائل ہوتی ہے۔ سوائے سویابین کے باقی تیل نکالنے والے بیج ہمارے ملک کی خاص زرعی پیداوار ہیں۔ بیجوں کی پیداوار ہماری اپنی ضروریات سے کہیں وافر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیل نکالنے والے بیج بڑی مقدار میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ اس سال کپاس کی پیداوار بہت ہی اچھی رہی۔ ظاہر ہے کہ کاٹن آئیل سیڈ (بنولہ) کی ہمارے ہاں ہرگز کمی نہیں ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بناسپتی گھی بنانے والے کارخانوں میں اس کے اپنے آئیل ایکسپیلر پلانٹ (OIL EXPELLER) ہیں۔ اس کے علاوہ: ملک میں جگہ جگہ بیجوں سے تیل نکالنے والی چھوٹی چھوٹی لاتعداد فیکٹریاں بھی قائم ہیں۔ گزشتہ چار سالوں کے دوران سویابین کے تیل کی درآمد میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ اب تو اسے فری لسٹ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ سویابین کا تیل -/۱۱۵ روپے فی من کے حساب سے مل اونروں کو باآسانی اور حسب خواہش فراہم کئے جانے کے سرکاری انتظامات ہیں۔ اس صورت میں خام مال کی کمی کا جواز سراسر بکواس اور لغو ہے۔ اس سال سویابین آئیل کی درآمد ۴ کروڑ سے بڑھ کر ۱۴ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔

جب تک سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے۔ نفع کمانے کی غرض سے اسمگل کئے جانے والے مال کی مقدار میں کمی بیشی تو ہو سکتی ہے لیکن اس کا سرے ہی سے خاتمہ ناممکن ہے۔ بناسپتی گھی کی اسمگلنگ پہلے بھی ہوتی تھی۔ یقیناً آج بھی ہو رہی ہے۔ خاص طور پر ایران، بلوچستان، افغانستان اور بھارت کے مغربی صوبوں کے لوگوں کی اکثریت ہمیشہ سے پاکستانی بناسپتی گھی ہی استعمال کرتی رہی ہے۔ تاہم موجودہ حکومت اس بات کی دعویدار ہے کہ اس نے اسمگلنگ پر کافی حد تک قابو پا لیا ہے۔ بس کہا جاتا ہے کہ گھی کی حالیہ گرانی اور قلت کی اصل وجہ اسمگلنگ بھی نہیں ہے۔

اب رہا سوال آبادی میں اضافے کا اور ملوں کی تعداد میں کمی کا تو اس وقت ہمارے ملک میں ۲۷ کارخانے بناسپتی گھی تیار کر رہے ہیں۔ دو کارخانوں کا گذشتہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں اضافہ ہوا ہے۔ آج سے چار سال قبل بناسپتی گھی بنانے والی ملوں کی تعداد انیس تھی۔ لیکن اس وقت سے لے کر ڈیڑھ ماہ پہلے تک ہمارے ملک میں گھی کی قطعاً کوئی قلت نہ تھی۔ کھلے بازار میں فروخت کیے جانے والے گھی کے کنستروں کے انبار موجود رہتے تھے۔ عام شہری جتنا چاہے چھوٹے پرچون فروشوں سے گھی خرید سکتا تھا۔

مغربی اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کی خوراک کا ایک اہم جزو کھانے کا تیل ہے۔ کیونکہ یہ دوسری چکنائیوں کی نسبت بہت سستا ہے۔ اگرچہ مشرقی بنگال میں تیل نکالنے والے بیج پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی پیداوار اس خطے کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس کمی کو مغربی پاکستان سے ہی پورا کیا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں بناسپتی گھی کا کوئی کارخانہ نہ ہونے کی وجہ سے تمام گھی مغربی پاکستان ہی سے فراہم کیا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجہ سے پاکستان میں گھی کے صارفین میں اضافہ نہیں بلکہ کمی ہوئی ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہماری ملیں تیرہ کروڑ انسانوں کی بجائے آج صرف چھ کروڑ انسانوں کی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں۔

رہا سوال ذخیرہ اندوزی کا تو یہ اخلاقی ہی نہیں قانونی جرم ہے۔ حکومت کے پاس بے پناہ وسائل اور اختیارات ہیں۔ ذخیرہ اندوزی کا جرم نفع کمانے کی غرض سے سرمایہ داروں ہی کے ہاتھوں سرزد ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی حکومت، مملکت کے بے پناہ وسائل اور اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کے باوجود مٹھی بھر سرمایہ داروں کو عوام دشمن سرگرمیوں سے باز نہیں رکھ سکتی تو اسے آج کے عوامی دور میں اقتدار سے چمٹے رہنے کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے۔ ایسی حکومت کو فوراً اقتدار سے الگ ہو جانا چاہیئے کیونکہ حکومت کے ہاتھ میں تمام وسائل اور اختیارات محض اس لیے دیئے جاتے ہیں کہ وہ عوام کے مفادات کا تحفظ کرے۔

اشیاء کی پیداوار کا تسلسل قائم رہے۔ یعنی نہ تو پیداوار میں کمی ہو اور نہ ہی اشیاء کی پیداوار کا سلسلہ رکنے پائے۔ اور کارخانوں سے باقاعدگی کے ساتھ طلب کے مطابق منڈی میں رسد پہنچتی رہے تو ذخیرہ اندوزی کے خطرناک رجحان کا امکان ہی نہیں رہتا۔ اب تو کارخانے کے گیٹ سے لے کر صارفین تک بناسپتی گھی کی فراہمی کا مکمل نظام پوری طرح حکومت کے کنٹرول میں ہے۔ اگر اب بھی ذخیرہ اندوزی ہی گھی کی قلت کی وجہ ہے تو پھر یقیناً اس ذخیرہ اندوزی کا ارتکاب حکومت خود کر رہی ہے، جو ایک سراسر غلط مفروضہ ہے۔ کوئی بھی حکومت جان بوجھ کر اپنے اقتدار کی مدت کو ایسی حماقت کے ذریعے مختصر نہیں کر سکتی۔ بے شک کسی شے کی گرانی اور قلت کا باعث اسمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی بھی ہو سکتی ہے، لیکن پاکستان میں گھی کی حالیہ قلت اور گرانی ایک سوچی سمجھی اور منظم سازش کا نتیجہ ہے۔

آیئے اب اپنے ملک میں بناسپتی گھی کی شدید قلت اور گرانی کی اصل وجہ دریافت کریں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے پاکستان میں گھی کی کوئی کمی نہ تھی۔ ساڑھے چار روپے سیر ہر جگہ گھی دستیاب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کارخانہ دار حکومت کے کاغذات میں درج شدہ غلط اور بوگس اعداد و شمار کی نسبت کہیں زیادہ گھی تیار کر کے بازار میں پہنچا رہے تھے۔ وہ عوام کی خدمت اور سہولت کے پیش نظر ایسا نہیں کر رہے تھے، بلکہ حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کروڑوں روپے کے ٹیکس کی چوری کرتے تھے۔ کارخانہ داروں کا دیرینہ مطالبہ تھا کہ ان سے کارخانہ کی پیداواری صلاحیت کے مطابق ڈیوٹی ٹیکس مجموعی طور پر وصول کیا جائے۔ حکومت نے ان کے اس مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے ہر کارخانہ کی زیادہ سے زیادہ

صاف شدہ تیل پر ۶ روپے اور بناسپتی گھی پر ۷ روپے فی ٹین ڈیوٹی

بناسپتی گھی کے خام مال کی قلت نہیں ہے

بناسپتی گھی افغانستان، ایران اور بھارت اسمگل کیا جا رہا ہے

پیداواری صلاحیت متعین کر کے ان پر ٹیکس عائد کر دیا۔ کسی کارخانہ کی پیداواری صلاحیت اور کارکردگی متعین کرنا اور وہ بھی موجودہ نوکر شاہی کے ذریعے، کوئی آسان کام نہ تھا۔ بہرحال یہ کام طوعاً کرہاً انجام پایا۔ ہر کارخانہ دار نے افسروں سے مل ملا کر اپنے کارخانہ کی کارکردگی حقیقی پیداواری گنجائش سے بہت ہی کم سرکاری کاغذات میں درج کرا دی۔ ایک علمی تجزیہ کے مطابق جس کارخانہ میں روزانہ پانچ ہزار کنستر گھی تیار کرنے کی گنجائش تھی اس کی روزانہ پیداواری کارکردگی ریکارڈ پر صرف ایک ہزار کنستر ظاہر کی گئی۔ جب یہ جعلی، مصنوعی اور سرمایہ داروں کے حسب منشا اعداد و شمار لکھ کر لئے گئے تو حکومت نے انہی مفروضہ اعداد و شمار کی بنیاد پر ڈیوٹی ٹیکس عائد کر دیا۔ سرمایہ دار حکومت کی اس احمقانہ نوازش پر بہت خوش ہوئے۔ فرضی اور غلط اعداد و شمار کی بنیاد پر ایکسائز ڈیوٹی متعین ہوتے ہی انہوں نے اپنے کارخانہ کی اصل صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ پیداوار شروع کر دی۔ کیونکہ جس کارخانہ سے حکومت صرف ایک ہزار کنستر کے حساب سے ٹیکس وصول کرتی تھی، اس کی کوشش یہ تھی کہ وہ روزانہ چھ ہزار کنستر پیدا کرے، تاکہ پانچ ہزار کنستروں کا ٹیکس مفت میں ہضم کر لیا جائے۔ ادھر حکومت مطمئن تھی کہ اس نے تو زیادہ سے زیادہ پیداواری صلاحیت متعین کر کے ان پر ٹیکس عائد کیا ہے۔ اُدھر کارخانہ دار اپنی جگہ مست تھے کہ ان کی چالبازی سو فیصد کامیاب رہی۔ لاکھوں روپے کا ٹیکس سرکاری خزانہ کی بجائے ان کی اپنی تجوریوں میں جمع ہو رہا تھا تاہم گھی وافر مقدار میں بازار میں آ رہا اور صارفین با آسانی اسے ساڑھے چار روپے سیر تک خریدتے رہے۔ نہ تو گھی کی قلت کا مسئلہ سامنے آیا اور نہ ہی گرانی کا احساس ہوا۔ سرمایہ داروں کی ہیرا پھیری نوٹس میں آئی تو حکومت چونک کر رہ گئی۔ بناسپتی گھی پر لگائے جانے والے ڈیوٹی ٹیکس کے رائج سسٹم کو تبدیل کرنے کی ضرورت فوری طور پر محسوس کی گئی۔ چنانچہ حکومت نے کارخانوں میں ایکسائز کا عملہ ہمہ وقتی مقرر کر دیا۔ تاکہ جتنا مال مل کے گیٹ سے باہر نکلے اتنا ہی ٹیکس وصول کیا جائے۔ کارخانہ دار تلملا کر رہ گئے۔ حکومت کے اس اقدام کا فوری ردِ عمل یہ ہوا کہ کارخانہ دار پیداوار کو گھٹا کر مفروضہ اور حکومت کے ریکارڈ میں پہلے سے درج شدہ جعلی اعداد و شمار پر لے آئے۔ انہوں نے گھی کی قیمتوں میں اضافہ کر دینے یا کارخانے بند کر دینے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو رام کرنے کی بھی کوششیں جاری رہیں، تاکہ وہ سرمایہ داروں کو اپنے مال کی قیمتیں بڑھا کر عوام کو لوٹنے کے مزید پروانے عائد کر دے۔ لہٰذا بناسپتی گھی مینو فیکچرز اپنے سنڈیکیٹ کے ذریعے مختلف بہانے بنا کر صدرِ پاکستان اور صوبے کے گورنروں سے اپیلیں کرتے رہے۔ سرمایہ داروں کی یہ اپیل نما دھمکیاں اخبارات کے پہلے صفحوں پر اشتہارات کی صورت میں شائع ہوتی رہیں۔

حکومت اور کارخانہ داروں کی بات چیت چلتی رہی۔ سرمایہ دار مصر تھے کہ قیمتیں بڑھانے کی اجازت دی جائے۔ حکومت چمکار کر بگڑے ان "مُنّوں" کو منا لینا چاہتی تھی۔ اسی اثناء میں سرمایہ داروں نے پاکستان کے غریب عوام کو مزید لوٹنے کے لئے ایک انوکھی سی سکیم سوچ لی، تاکہ حکومت کو بھی سبق سکھایا جا سکے۔ اور ان کے نفع میں بھی کوئی کمی نہ ہونے پائے۔ انہوں نے حکومت سے گزارش کی کہ جناب گھی کے علاوہ تھوڑی سی مقدار میں ہم لوگ صاف شدہ تیل بھی منڈی میں بھجواتے ہیں۔ جس کے نرخ گھی کی نسبت بہت کم ہیں۔ لہٰذا اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تو اس صاف شدہ تیل پر ڈیوٹی ٹیکس معاف کر دیا جائے۔

حکومت نے سرمایہ داروں کے لئے اپنی روایاتی فیاضی سے کام لیتے ہوئے صاف شدہ تیل پر مبلغ چھ روپے اور گھی پر سترہ روپے فی ٹین ڈیوٹی ٹیکس عائد کر دیا۔ سرمایہ داروں کا گھی کی بجائے صاف شدہ تیل مہیا کر کے عوام کو لوٹنے کا منصوبہ تھا، جو حکومت کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ حکومت اور سرمایہ داروں کے درمیان تیل پر ٹیکس کی رعایت کی صورت میں معاملہ طے پا گیا۔

اس صاف شدہ تیل (REFIND OIL) والے فراڈ اور سرمایہ داروں کی سازش کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس موقع پر بناسپتی گھی کی تیاری کی وضاحت کی جائے۔ سب سے پہلے بنولے کے تیل میں ۵ فیصد سے لے کر ۴۰ فیصد تک سویا بین کا تیل ملایا جاتا ہے۔ سویا بین کے تیل کی نسبت جتنی زیادہ ہو گی، بناسپتی گھی کی کوالٹی اتنی ہی اچھی ہو گی۔ بنولے اور سویا بین کے تیل کو مخصوص کیمیکلز اور مشینوں کے ذریعے صاف کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے تیل میں سوڈا کاسٹک اور دیگر کیمیائی اجزاء کی آمیزش کی جاتی ہے۔ اس عمل سے تیل میں شامل حیاتیاتی وٹامن ختم ہو جاتے ہیں۔ جب تیل کی رنگت اور گدلاہٹ دور ہو جاتی ہے تو اس شفاف تیل میں کیمیائی طریقوں سے حاصل کردہ وٹامن شامل کئے جاتے ہیں۔ بعد ازاں اسے ہائیڈروجن پریشر ٹینک سے گزارا جاتا ہے، جس سے بنولے اور سویا بین کا شفاف تیل بناسپتی گھی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہائیڈروجن پریشر ٹینک سے مائع شکل میں نکلنے والے اس بناسپتی گھی کو کنستروں اور ڈبوں میں بھر کر سرد خانے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ بارہ گھنٹے کے بعد گھی منجمد شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ بناسپتی گھی بنولے اور سویا بین کے صاف شدہ تیل کی منجمد شکل ہے۔

حکومت گھی کی تقسیم کو کنٹرول میں لینے کی بجائے پیداوار کے ذرائع کو کنٹرول میں لے

قبل ازیں ایک دو فیکٹریاں گھی کے علاوہ بنولے اور سویابین کا صاف شدہ تیل بھی مارکیٹ میں لاتی تھیں لیکن بہت ہی تھوڑی مقدار میں۔ یہ تیل گھی کی نسبت سستے داموں فروخت ہوتا تھا۔ جسے پکوڑے تلنے اور بیکری یا ہوٹل وغیرہ کی صنعت میں استعمال کیا جاتا تھا۔

بناسپتی گھی کی مصنوعی قلت پیدا کئے بغیر مذموم مقاصد حاصل نہیں کئے جا سکتے تھے۔ قلت پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ گھی کی پیداوار یا تو روک دی جائے یا اس میں خاطر خواہ کمی کر دی جائے۔ کارخانہ داروں نے یکایک پیداوار گھٹا دی۔ حکومت ان کے آگے بے بس تھی کیونکہ حکومت کے ریکارڈ میں تو پہلے ہی سے ہر کارخانہ کی زیادہ سے زیادہ پیداوار سے متعلق جعلی اعداد و شمار محفوظ تھے۔ ملوں نے ان ہی اعداد و شمار کے مطابق گھی بنانا شروع کر دیا۔ ہر کارخانہ کی پیداوار اس کی حقیقی پیداواری صلاحیت کی نسبت بہت کم تھی۔ مل مالکوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اپنے کارخانے کے ہائیڈروجن پریشر پلانٹ میں نقص پیدا کر کے اعلان کر دیا کہ ہماری مشینری خراب ہو گئی ہے اس لئے ہم گھی تیار کرنے سے معذور ہیں۔ ایک ہوشیار کارخانہ دار نے تو اپنی فیکٹری کے ہائیڈروجن پریشر ٹینک ہی کو اڑا دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ ہم چھ ماہ تک گھی تیار نہیں کر سکیں گے۔ راز کی بات یہ ہے کہ ہر کارخانہ کی ریفائنری بالکل درست کام کر رہی ہے۔ لیکن ہر کارخانہ کے ہائیڈروجن پریشر ٹینک میں کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ گھی کی مصنوعی قلت پیدا کرنے میں نادانستہ طور پر ہی سہی ہماری حکومت نے بھی سرمایہ داروں کا ہاتھ بٹایا ہے۔ حکومت نے پیداوار کے ذرائع کو کنٹرول میں لینے کی بجائے گھی کی تقسیم کو کنٹرول میں لے لیا ہے۔ جس سے بازار میں گھی بالکل عنقا ہو گیا۔ سرمایہ دار یہی تو چاہتے تھے۔

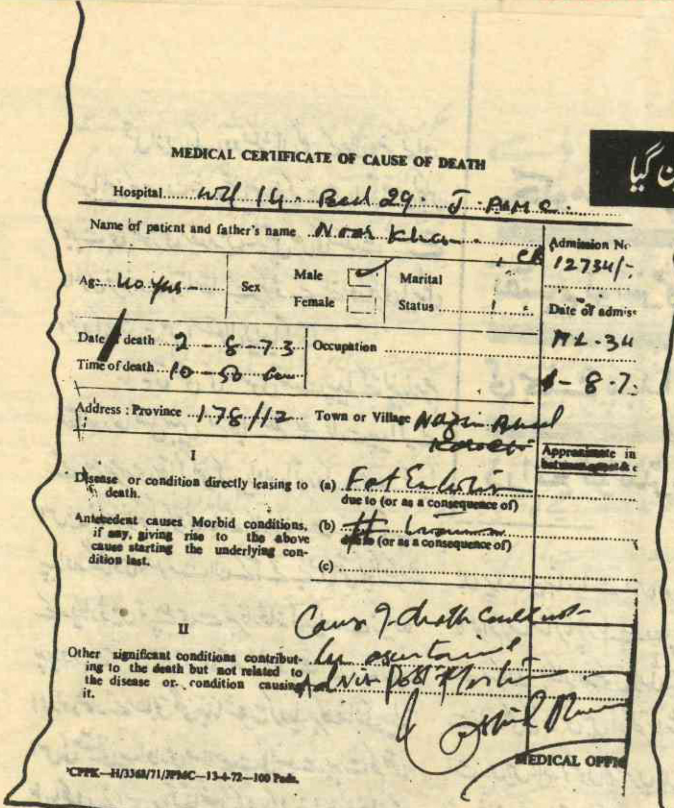
حکومت نے ضلعی انتظامیہ کے بعض افسروں اور برسر اقتدار پارٹی کے مقامی کارکنوں کو گھی کی تقسیم کے سلسلہ میں پردھان بنا دیا ہے۔ اس طرح جن زیادتیوں اور مشکلات کا عوام کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ ایک المناک واقعہ ہے۔ سرکاری اہلکار اور حکومتی پارٹی کے کارکن مل کر ایک سیر سے زائد گھی کی تلاش میں گھر گھر تلاشیاں لے رہے ہیں۔ اشرفیاں لٹ رہی ہیں، اور کوئلوں پر مہریں ہیں۔ ہمارے "ڈان کوئکزوٹ" بڑے خلوص کے ساتھ ہوائی چکیوں پر حملے کر رہے ہیں۔ چوروں کی ماؤں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہوشیار اور چالاک چوروں کو پکڑنے کی ناکام کوششیں جاری ہیں۔ چوروں کی مائیں اہلکاروں کی جھنجھلاہٹ اور حکومت کی کوتاہ بینی پر یقیناً بغلیں بجاتی ہوں گی۔

ہمارے ملک میں چوروں کی مائیں سرمایہ دار اور صنعتکار ہیں۔ جو ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ، مہنگائی اور ہر برائی کو جنم دیتے ہیں۔ اور عوام کو لوٹ لینے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ گھی کے مل مالکان نے موقع کی نزاکت سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہوئے بناسپتی گھی کی بجائے بنولے اور سویابین کا تیل من مانی قیمت پر کھلے بازار میں بیچنا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ گھی میسر نہیں آتا اس لئے لوگ یہ مضر صحت مہنگا تیل کھانے کے لئے مجبور ہیں۔ بناسپتی گھی بنانے والی تمام ملیں اب گھی کی بجائے بنولے اور سویابین کا صاف شدہ تیل اپنے اپنے خاص ٹریڈ مارک کے تحت بازار میں لے آئی ہیں۔ اس تیل کو ککنگ آئل کے نام سے ۹۵ روپے فی ٹین کے حساب سے بیچا جا رہا ہے۔ جبکہ اسی تیل سے تیار شدہ بناسپتی گھی کی قیمت ۷۷ روپے فی ٹین مقرر ہے۔ پرچون فروش اور چھوٹے دکاندار تیل کا ۳۵ پونڈ کا کنستر مل مالکان کے ایجنٹوں سے ۱۰۵ روپے میں خرید کر سات سے آٹھ روپے فی سیر تک عوام کے پاس فروخت کر رہے ہیں! اندازہ کیجئے کہ حکومت سویابین کا تیل مل مالکان کو ایک سو پندرہ روپے فی من مہیا کر رہی ہے۔ اگر لوگوں کو سویابین کا تیل ہی کھلانا ہے تو پھر سرمایہ داروں کے ذریعے کیوں کھلایا جا رہا ہے۔ اسے کھلے بازار میں تین روپے سیر کیوں نہیں فروخت کیا جاتا۔ سرمایہ داروں کو اجارہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔

سلوا بناسپتی گھی بنانے والی کمپنی "سورج مکھی" کے نام سے خام تیل فروخت کر رہی ہے۔ ضیاء بناسپتی والوں نے "لاثانی آئل" کے نام سے تیل فروشی شروع کر رکھی ہے۔ کوہ نور بناسپتی والے شیراز اور گولڈن آئل وغیرہ کے نام سے سویابین کا تیل ۹۵ روپے میں پونے سترہ سیر فروخت کر رہے ہیں۔ غضب خدا کا ہر کمپنی نے یہی کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ گھی کے صنعتکاروں کو گھی بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ خام تیل کنستروں میں بند کر کے عوام کی کھالیں ادھیڑ رہے ہیں۔ گھی کا ٹین انہیں ۷۷ روپے میں فروخت کرنا پڑتا ہے، جبکہ تیل کا ۳۵ پونڈ کا ٹین ۹۵ روپے میں بک رہا ہے۔ گھی کے ٹین پر انہیں ۱۷ روپے فی ٹین ڈیوٹی ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ تیل کے کاروبار میں وہ حکومت کو صرف چھ روپے میں ٹرخا دیتے ہیں۔ گھی کی تیاری کی صورت میں ہائیڈروجن پریشر ٹینک، اور سرد خانوں کے مصارف کی وجہ سے لاگت بڑھ جاتی ہے۔ گھی کی کل لاگت ۳ روپے ۷۲ پیسے فی سیر ہے، جبکہ تیل کی صفائی پر برائے نام خرچ اٹھتا ہے۔ گھی کی فروخت پر پابندی ہے۔ تیل کی فروخت تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔

باقاعدہ منصوبے کے تحت ایک طرف سرمایہ دار حکومت کو کروڑوں روپے کے ٹیکس سے محروم کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بڑی ڈھٹائی کے ساتھ عوام کو لوٹا جا رہا ہے۔ ●

بناسپتی گھی مینوفیکچرز سنڈیکیٹ نے حکومت کو اپیل نما دھمکیاں دیں!!



MEDICAL CERTIFICATE OF CAUSE OF DEATH

Hospital ...... W/ 14 - Bed 29 - J.P.M.C. ......

Name of patient and father's name ...... Noor Khan ...... Admission No. 12734/-

Age ... 40 yrs ... Sex: Male ✓ Female ☐ — Marital Status ......

Date of death ... 2 - 8 - 73 — Occupation ...... — Date of admission: ML-34, 1-8-73

Time of death ... 10-50 am ...

Address: Province ... 178/II-2 ... Town or Village: Nazim Abad, Karachi

Approximate interval between onset & death

I

Disease or condition directly leading to death. (a) Fat Embolism — due to (or as a consequence of)

Antecedent causes Morbid conditions, if any, giving rise to the above cause starting the underlying condition last. (b) # ...... — due to (or as a consequence of) (c) ......

II

Other significant conditions contributing to the death but not related to the disease or condition causing it. — Cause of death could be ascertained after Post Mortem

MEDICAL OFFICER

CPPK—H/3368/71/JPMC—13-4-72—100 Pads.

انسان انسان کے ہاتھوں تماشہ بن گیا

ڈاکٹروں کی لاپرواہی نے اس کی جان لے لی

الفتح رپورٹ

نورخان کا مردہ جسم چھ گھنٹے تک پولیس کا انتظار کرتا رہا

یکم اگست کو ایئرپورٹ ڈویلپمنٹ ایجنسی کا ڈسپیچ رائڈر نورخان سرکاری کام سے جا رہا تھا کہ لگژری سینما کے قریب ایک منی بس نے عقب کی جانب سے اسے ٹکر ماردی۔ نورخان اپنی موٹرسائیکل سے نیچے گر پڑا۔ وہ شدید زخمی ہوگیا تھا لیکن اس کی حالت خطرناک نہ تھی۔

اس وقت دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ حادثہ کی اطلاع دفتر پہنچ گئی جو وقوعہ کی جگہ سے زیادہ دور نہ تھا۔ دفتر کے ایک ملازم دوست ایس۔ ایم اقبال زخمی نورخان کو گورنمنٹ ڈسپنسری کراچی ایئرپورٹ لے گیا۔ جہاں اسے ابتدائی طبی امداد دی گئی، اور اسے فوراً جناح ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا گیا۔ اس وقت نورخان بالکل ہوش میں تھا۔ اور اپنے دوستوں سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ حادثہ کی خبر سُن کر نورخان کا سالہ صغیرخان بھی پہنچ گیا تھا۔ نورخان نے اس سے کہا۔ "تم گھر والوں کو تسلی دینا، معمولی چوٹ ہے، ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

نورخان کو فوری طور پر جناح ہسپتال کے شعبہ حادثات میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت اس کے علاوہ صرف ایک مریض تھا۔ امکان تھا کہ ڈاکٹر فوراً اس کی طرف توجہ دیں گے۔ لیکن سرکاری ہسپتالوں کی روایات میں پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی میں انسانی ہمدردی کو کچھ زیادہ دخل حاصل نہیں ہے۔ اس لئے پونے چار بجے کے قریب ڈاکٹر فاروقی نے اسے اٹینڈ کیا۔ اس دوران وہ کیا کرتے رہے اس کا جواب تو شائد وہ خود بھی نہ دے سکیں۔ نورخان کو ڈریسنگ روم میں لے جایا گیا۔ اور اسی طرح زخموں پر مرہم رکھ کر پٹی کردی گئی۔ ڈاکٹر فاروقی نے صغیرخان سے سوال کیا۔ "کیا اس حادثہ کی رپورٹ پولیس میں درج کرادی گئی۔؟"

صغیرخان نے نفی میں جواب دیا۔ انہوں نے اس سے سولہ روپے طلب کئے۔

صغیرخان نے پوچھا کس لئے۔؟

انہوں نے جواب دیا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی فیس ہے۔ اس نے سولہ روپے نکال کر ڈاکٹر کے حوالے کر دیئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ زخمی کو خون دینا ہے، اس لئے خون کا انتظام کرو۔ اور نورخان کو ایکسرے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ایکسرے کرانے کے بعد جب وہ واپس آ رہا تھا تو اس کے گھر والے پہنچ گئے، جنہیں دیکھ کر اس نے کہا۔ "تم لوگ ناحق گھبرا گئے۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور بشاشت تھی۔

ایکسرے کے بعد اسے دوبارہ شعبہ حادثات کے ایک اسٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایکسرے کی رپورٹ مل گئی، جس سے پتہ چلا کہ اس کی ران کی ہڈی ایک دو جگہ سے فریکچر ہو گئی ہے۔ کہنی میں معمولی چوٹ آئی تھی۔ بائیں پیر کی ایڑی میں گہری چوٹ کے سبب کھال پھٹ گئی تھی۔ نورخان کو شدید پیاس لگ رہی تھی۔ وہ بار بار پانی مانگ رہا تھا، لیکن کسی نے اس کی جانب توجہ نہ دی۔ مجبوراً صغیرخان نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس وقت پانی نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ چوسنے کے لئے برف کی ڈلی دے دو چنانچہ اس ہدایت کے مطابق وقفہ وقفہ سے نورخان کو برف کی ڈلی دی گئی۔ ڈاکٹر فاروقی نے ابتداء میں زخمی کو گلوکوز چڑھانے کی ہدایت

دی تھی۔ لیکن وہ ہسپتال ہی کیا جہاں ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کیا جائے اور مریضوں پر خاطر خواہ توجہ دی جائے۔ دو ڈھائی گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی جب نور خان کو گلوکوز نہیں دیا گیا تو صغیر خان نے دوبارہ ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ انہوں نے بڑی بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وارڈ بوائے کو گلوکوز دینے کا حکم دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے اس حکم کی تعمیل پر مزید ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ اس پر طرّہ یہ کہ گلوکوز نور خان کے جسم میں جانے کی بجائے باہر بہتا رہا۔ نور خان نے کئی بار وارڈ بوائے اور نرس سے کہا کہ وہ گلوکوز کی سرنج ٹھیک کر دیں، مگر انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ جب گلوکوز کی تھیلی آدھی رہ گئی تو کسی نرس نے کھا کر ٹھیک کر دیا۔ نور خان اس وقت بھی ہوش و حواس میں تھا۔ اس دوران اس کے کئی ملاقاتی آئے، جن سے اس نے باتیں کیں۔ اور ہر شخص کو تسلی دی "معمولی حادثہ ہے چند روز میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

رات کو دس بجے ایک دوسرے ڈاکٹر لغاری آئے۔ انہوں نے اس کے زخموں کا معائنہ کیا۔ اور دوبارہ ڈریسنگ روم میں اس کی مرہم پٹی کی گئی۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ایک تیسرے ڈاکٹر نے نور خان کو وارڈ نمبر ۱۴، بیڈ نمبر ۲۹ پر منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر لغاری نے نور خان سے خاصی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ اور اسے اپنے ہاتھوں سے بیڈ پر لٹا دیا۔ وارڈ میں نور خان کو ایک بوتل خون دیا گیا۔

بیڈ پر لٹانے کے بعد نور خان پر غشی طاری ہو گئی۔ صغیر خان نے ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اسے بتایا گیا کہ نور خان کو نیند کا انجکشن دیا گیا ہے۔ شب کے تقریباً ڈھائی بجے اسے سانس لینے میں تکلیف شروع ہوئی۔ صغیر خان نے جو اس کے قریب ہی جاگ رہا تھا۔ اس نے متعدد مرتبہ نرسوں اور ڈاکٹروں کو اس کی اچانک بگڑتی ہوئی حالت کی اطلاع دی، مگر کسی نے اس کی دیکھ بھال پر توجہ نہ دی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے ایک ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور زخمی نور خان کو خون کی دوسری بوتل چڑھانے کا مشورہ دیا۔ علاوہ ازیں اسے آکسیجن بھی دینے کے لئے کہا۔ صغیر خان نے بتایا کہ سرنج اتنی چھوٹی تھی کہ آکسیجن صحیح طریقہ سے اس کے جسم میں منتقل نہیں ہو رہی تھی۔ اور اس پر ایک تکلیف دہ کیفیت طاری تھی۔ صغیر خان پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگتا رہا، مگر نرس، وارڈ بوائے اور ڈاکٹر سبھی اس کی جانب سے لاپرواہ تھے۔ جب اس کی سانس زیادہ بگڑ گئی تو صغیر نے ایک سسٹر کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور انسانیت کا واسطہ دے کر کہا: "کسی ڈاکٹر کو بلوا دیں۔ نور خان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔" سسٹر نے — رحم کی اس اپیل کو شرف قبولیت بخشا اور ازراہِ کرم ڈاکٹر لغاری کو اپنے ساتھ لے کر واپس آئی۔ ڈاکٹر نے نور خان کو دیکھا، چند دوائیں دیں جس سے اس کی حالت سنبھل گئی۔

سوا دس بجے نور خان کی حالت دوبارہ بگڑنے لگی۔ صغیر خان نے دوبارہ سسٹر کو اس کی کیفیت سے آگاہ کیا۔ سسٹر نے

ڈاکٹر اس کی موت کے اسباب معلوم نہ کر سکے

فون پر ڈاکٹر رشید کو مریض کی حالت سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر رشید جب پہنچے تو زخمی نور خان زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔

یہاں سے اس اندوہناک واقعہ کا دوسرا رُخ شروع ہوتا ہے۔ نور خان کے انتقال کے بعد اس کے سالے صغیر خان سے کہا گیا کہ چونکہ یہ ایکسیڈنٹ کا کیس ہے اس لئے لاش مردہ خانے بھیجی جا رہی ہے۔ پولیس لاش کو دیکھنے کے بعد آپ کے حوالے کر دے گی۔" نور خان کے انتقال کی خبر جب اس کے گھر پہنچی تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔ نور خان کو اتنی چوٹ نہیں آئی تھی کہ لوگ اس کی موت کا اتنی آسانی سے یقین کر لیتے۔ یہ خبر ان کے لئے دھماکہ سے کم نہ تھی۔ ہر شخص سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ اگر نور خان کو زیادہ چوٹیں آئی تھیں تو پھر اتنی دیر ڈاکٹر کیا کرتے رہے؟ جو لوگ نور خان سے مل چکے تھے۔ انہیں اس خبر پر تو مطلق یقین نہیں آ رہا تھا۔ مرنے والے ایسے نہیں ہوتے، جیسے نور خان نظر آ رہا تھا۔

صغیر خان نے پولیس والوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ قانونی خانہ پُری کے بعد لاش حاصل کی جا سکے۔ لیکن واہ رے قانون کے محافظ، وہ تین بجے تک دستیاب نہ ہو سکے۔ خدا خدا کر کے ½ ۳ بجے ان کی آمد ہوئی۔ انہوں نے ضروری خانہ پُری کے بعد صغیر خان سے کہا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو گا۔ یہ دوسرا دھماکہ تھا۔ اس نے اس کا جواز مانگا تو پولیس والوں نے ڈاکٹر کا جاری کردہ ڈیتھ سرٹیفیکیٹ سامنے رکھ دیا۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلم خاص سے لکھا تھا۔ "موت کے اسباب معلوم نہیں ہوئے اس لئے لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔" صغیر خان نے اس پر احتجاج کیا کہ نور خان گزشتہ انیس بیس گھنٹوں سے ہسپتال میں تھا۔ آخر ڈاکٹروں نے اس دوران کیا کیا۔ کیا اتنی مدت کسی اندرونی چوٹ کا پتہ چلانے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دوران ڈاکٹروں نے کچھ نہیں کیا اور بظاہر انہیں جو چوٹ نظر آئی اس کی مرہم پٹی کر کے چھوڑ دی۔" ڈاکٹر نے صغیر کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ پوسٹ مارٹم کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر کی باتوں سے صغیر خان پوسٹ مارٹم کرانے پر رضامند ہو گیا۔ تقریباً شام کو چھ بجے پوسٹ مارٹم کے لئے لاش سول ہسپتال روانہ کر دی گئی۔ اور ½ ۷ بجے لاش صغیر خان اور اس کے ورثا کے حوالے کی گئی۔ ادھر نور خان کے رشتہ داروں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ جو بھی یہ خبر سنتا اپنا سر پیٹ لیتا۔ نور خان ملنسار، خلیق اور دوست نواز انسان تھا۔ وہ معمولی ڈسپیچ رائڈر تھا۔ قلیل تنخواہ ملتی تھی کنبہ بڑا تھا چار بچے پہلے سے تھے اور ایک بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ اسکی غمزدہ بیوی کی دنیا تاریک ہو کر رہ گئی۔ بوڑھے ماں باپ کا سہارا چھن گیا۔ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے پارٹ ٹائم کرتا تھا۔ مشکل سے اسے چار پانچ گھنٹے آرام کرنے کے لئے ملتے تھے۔ اس نے اپنی پوری زندگی اپنی بیوی، بچوں اور والدین کی

باقی صفحہ ۳۱ پر

قائد اعظم اسلامی ریاست کے حامی نہیں تھے

وھاب صدیقی



"جب
انسانی تاریخ میں
ایسا وقت آتا ہے کہ ایک قوم
ان تمام سیاسی بندشوں کو توڑ دے جو
اسے دوسری قوم کا پابند کر دیتی ہیں اور اپنا ایک علیحدہ
اور مساوی وجود قائم کرے جس کا حق اسے قوانینِ فطرت اور
خالق کائنات نے عطا کیا ہے تو رائے عامہ کے احترام کو ملحوظ
رکھتے ہوئے ان اسباب کا اعلان کرنا ضروری ہو جاتا ہے
جن کی بنا پر وہ قوم علیحدگی اختیار کرنا چاہتی
ہے" (امریکہ کا اعلان آزادی)

نواب سلیم اللہ کو ایک لاکھ پونڈ کا قرضہ کم شرح سود پر دیا گیا

سقوطِ ڈھاکہ، سندھو دیش، پختونستان، اور عظیم تر بلوچستان تحریکیں دعوتِ فکر دیتی ہیں کہ اس نظریہ کی اساس کا، جو قیام پاکستان کا موجب بنا، ان محرکات اور عوامل کا جو تقسیم برصغیر کی وجہ بنے، سقوط ڈھاکہ، سندھو دیش، پختونستان اور عظیم تر بلوچستان تحریکوں کے محرکات کا تعصب کی عینک اتار کر سائنسی تجزیہ کیا جائے۔

فرنگی لیڈروں نے جب "سونے کی چڑیا" کے پر نوچنے کے لئے ہندوستان کو اپنی نو آبادیاتی بنایا، تو ہندوستان میں زمین پر ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ قدرے بگڑی ہوئی شکل میں مشترکہ ملکیت کا رواج تھا۔ اور ابتدائی کمیونزم نے آگے بڑھ کر زمین داری اور جاگیرداری نظام کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔

اینگلس نے جون ۱۸۵۳ء میں مارکس کو لکھا کہ "مشرق میں زمین پر ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ یہی مشرقی مسائل کی کنجی ہے۔" اینگلس کے خیال میں مشرق میں زمین داری اور جاگیرداری نظام کے نہ ہونے کا سبب وہاں کے طبعی حالات اور آب و ہوا تھی چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"آخر کیا وجہ ہے کہ اہل مشرق زمین داری اور جاگیرداری نظام کی منزل تک نہیں پہنچے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اصل وجہ آب و ہوا اور زمین کی خاصیتیں ہیں۔ خصوصاً وہ وسیع ریگستانی علاقے جو صحرائے اعظم سے عرب، ایران، ہندوستان اور تاتار ہوتے ہوئے ایشیا کی کوہستانی سطح مرتفع تک پھیلے ہوئے ہیں، وہاں زراعت کی اولین شرط نہروں سے آبپاشی ہے اور وہ برادری کا کام ہے یا پھر صوبائی اور مرکزی حکومت اس کو انجام دے سکتی ہے۔" (اینگلس کا خط مارکس کے نام ۶ جون ۱۸۵۳ء)

اس کے برخلاف برطانیہ اور یورپ سرمایہ داری کے دور میں داخل [illegible] سرمایہ داری نظام کی نشوونما اور فروغ کے لئے ضروری تھا کہ بیرونی منڈیوں کا قبضہ جمایا جائے۔ ہندوستان، چین، آسٹریلیا اور کیلی فورنیا کی منڈیاں یورپ کے لئے بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ برطانوی سرمایہ داری کو فروغ دینے کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کے اقتصادی ڈھانچے پر ضرب کاری لگائی جائے۔ چنانچہ انہوں نے دیسی برادریاں توڑ ڈالیں، دیسی صنعت و حرفت کی جڑیں کاٹ دیں۔ اور زمین کی مشترکہ ملکیت کا نظام ختم کر دیا۔ زرعی ڈھانچہ تبدیل کرنے سے کسانوں اور کاشت کاروں کی زندگی اجیرن ہو گئی وہ بھوک اور افلاس کا شکار ہو گئے۔ کارل مارکس کسانوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے برطانوی استحصال کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"یہ لگان کبھی کبھی اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ ان حالات

برطانیہ کو ہندوستان سے ۵ لاکھ پونڈ سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی

اور وسائل کا دوبارہ پیدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جن سے پیداوار قائم رکھی جاسکے۔ پیداوار کی توسیع تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے اور خود کاشت کار اس قدر تہی دست ہو جاتا ہے۔ کہ کم سے کم خوراک پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ حالت ایسے وقت میں خاص کر پیش آتی ہے جب ایک فاتح صنعتی قوم استحصال پر آمادہ ہو جیسے انگریز ہندوستان میں،، (مارکس "سرمایہ")

برطانوی سرمایہ داری کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان کو بطور منڈی استعمال کیا جانے لگا۔ ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کے انبار لگا دیئے گئے۔ ۱۷۸۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان ہندوستان کو بھیجی جانے والی مصنوعات ۳۸۶۱۵۲ پونڈ سے بڑھ کر ۸۰۲۴۰۰۰ پونڈ یعنی برطانیہ کی مجموعی برآمد کے ۳۲ ویں حصے سے بڑھ کر آٹھواں حصہ ہوگئی۔ ۱۸۵۰ء میں برطانوی سوتی مصنوعات پر جس کی برآمد کا چوتھائی حصہ ہندوستان کی منڈی میں آتا تھا۔ برطانوی آبادی کے آٹھویں حصہ کی معاش منحصر تھی اور اس سے مجموعی قومی آمدنی کا بارھواں حصہ حاصل ہوتا تھا۔

" ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۶ء تک برطانیہ سے ہندوستان کو سوت کی برآمد میں ایک کا ۵۲۰۰ کے تناسب سے اضافہ ہوا۔ ۱۸۲۴ء میں ہندوستان کو جو برطانوی ململ بھیجی گئی وہ بمشکل ساٹھ لاکھ گز تھی۔ مگر ۱۸۳۷ء میں اس کی مقدار چھ کروڑ چالیس لاکھ گز تک پہنچ گئی لیکن دوسری طرف (ہندوستانی ململ کے مرکز) ڈھاکے کی آبادی جو ایک لاکھ پچاس ہزار تھی اب صرف بیس ہزار رہ گئی ہے۔ ہندوستان کے شہر جو اپنی ململ کے لئے مشہور تھے، ویران ہوگئے۔ لیکن اسی پر مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ برطانوی دخانی مشینوں اور سائنس نے ہندوستان کے طول اور عرض میں زراعت اور دستکاری کے اتحاد کی جڑ کاٹ دی (مارکس "ہندوستان میں برطانوی حکومت")

"برطانیہ پارچہ بافی کی مشینوں نے ہندوستان میں بڑا زبردست اثر پیدا کیا ۳۵-۱۸۳۴ء میں گورنر جنرل نے رپورٹ دی تھی کہ "تجارت کی ساری تاریخ میں ایسی فلاکت اور افلاس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ پارچہ بافوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدان میں پڑی ہوئی سوکھ رہی ہیں" (مارکس "سرمایہ")

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دولت کے دریا مشرق سے مغرب کی طرف رواں ہوگئے۔ ہندوستان کو نوآبادی بنالے کے بعد برطانوی صنعت نے جتنی حیرت انگیز ترقی کی، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، برطانوی خزانہ میں ہندوستان کی دولت جمع ہونے لگی۔ برطانیہ، ہندوستان سے جو خراج وصول کرتا تھا۔ اس کا ذکر مارکس نے ان الفاظ میں کیا۔

"ہندوستان کو "اچھی حکومت"، کے واسطے خراج اور سود اور منافع کی رقم ملا کر کل پچاس لاکھ پونڈ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں وہ رقم شامل نہیں ہے۔ جو عہدے دار اپنی تنخواہ سے بچا کر ہر سال گھر بھیجتے ہیں اور انگریز سوداگر صنعت میں لگانے کے لئے انگلستان روانہ کرتے ہیں" (مارکس "سرمایہ")



ہندوستان میں برطانوی معیشت کی فتح

"تاریخ کا غیر شعوری آلہ" تھی مارکس

خود برطانوی حکمران طبقہ نے اس لوٹ کھسوٹ کا اعتراف کیا۔ برطانوی پارلیمان میں صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ برک نے کہا "اگر آج ہمیں ہندوستان سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ہمارا دور حکومت بھیڑیوں اور درندوں کی حکمرانی سے کچھ بہتر تھا" ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کانوالس نے ۱۸ ستمبر ۱۷۸۹ء کو اعلان کیا کہ "میں بلا خوف تردید پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کمپنی کے ہندوستانی علاقہ کا ایک تہائی حصہ بالکل جنگل بن گیا ہے۔ جس میں صرف وحشی درندے رہتے ہیں"، لینن نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا اور لکھا "اس تشدد اور لوٹ کھسوٹ کی کوئی حد نہیں جس کا نام ہندوستان میں برطانوی حکومت ہے"

اگرچہ ہندوستان پر برطانوی معیشت کا تسلط "سور کی طرح ناپاک اور بے غیرت"، تھا۔ لیکن دراصل برطانوی معیشت کی یہ فتح "تاریخ کا غیر شعوری آلہ"، تھا۔ کیونکہ ہندوستانی تمدن، دیسی تنظیموں، دیسی برادریوں، دیسی سماج اور مذہبی پیشواؤں نے ہندوستانی عوام ذلت کی اتنی گہرائیوں میں گرا دیا تھا کہ انسانیت کے جوہر غارت ہوگئے، انسان پست ہوگیا اور اس پستی کا اظہار یوں کیا کہ انسان جو فطرت میں سب سے برتر تھا، سربسجود ہوگیا اور ہنومان، بندر اور سبالا گائے کی پوجا کرنے لگا۔ ہندوستان کی سماجی حالت میں بنیادی انقلاب کئے بغیر انسانیت اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب کے اسباب پیدا کرنے میں انگلستان کے اغراض حد درجہ ذلیل مصلحتوں پر مبنی تھے اور ان کو پورا کرنے میں انتہائی حماقت سے کام لیا گیا۔ لیکن یہ انقلاب لانے کے لئے تاریخ کا غیر شعوری آلہ تھے کیونکہ اس تخریب کے بعد تعمیر کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔

ہندوستان میں برطانوی راج کے "تعمیری" پہلو کو مدِنظر رکھتے ہوئے مارکس نے ان چیزوں میں تعمیر کا آغاز دیکھا۔



"اس تشدد اور لوٹ کھسوٹ کی کوئی حد نہیں جس کا نام ہندوستان میں برطانوی حکومت ہے"

—— لینن

(۱) سیاسی اتحاد: شاہان مغلیہ کے عہد کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستحکم اور وسیع ہوا اور تار برقی سے اس کو تقویت اور پائیداری نصیب ہوئی۔

(۲) دیسی فوج (۱۸۵۷ء کے بعد اس فوج کو خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا اور پھر فوج میں ایک تہائی انگریز رکھے جانے لگے اور انگریزوں کا فوجی قبضہ بہت مستحکم کر لیا گیا)

(۳) آزاد اخبارات ایشیائی سماج میں پہلی بار نمودار ہوئے

(۴) ہندوستانیوں کی ایک تعلیم یافتہ جماعت، باول نخواستہ اور تعداد ہی میں سہی وجود میں آئی جو حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور یورپی سائنس کے خیالات میں رچی ہوئی تھی۔

(۵) نقل و حمل کے ذرائع فروغ دیئے گئے۔ ریلوے کے جال بچھائے گئے اور دخانی وسیلوں کی بدولت یورپ سے مستقل اور تیز تر آمد و رفت کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

انگریز اپنے ساتھ جو نظام لائے اس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معاشرہ نے ایک نئی کروٹ لی، پیداواری رشتوں اور پیداواری طاقتوں میں بدل آئی۔ پیداواری رشتوں کے بدلنے سے معاشرتی اقدار میں تبدیلیاں ہوئیں۔ اس موقع پر ہندوستانیوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ بھاپ اور بجلی کے زمانے میں وہ بجلی کے بلب میں دلچسپی لیں یا الہ دین کے چراغ میں، اسے اتفاق کہیے کہ جن ہندوستانیوں نے معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق وہ بجلی کے بلب میں دلچسپی لی، اُن کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ نو دولتیے بنیوں اور مارواڑیوں کا ایک طبقہ وجود میں آیا۔ انگریزوں نے اپنے مفادات کے لئے اس نئے ملکی طبقے کو تقویت دی اور یہ آہستہ آہستہ صنعت اور تجارت پر چھاتا گیا چنانچہ مشہور ڈپلومیٹ پانیکار لکھتا ہے۔

"یورپی اقوام کے تجارتی مرکزوں کے قیام کی وجہ سے ہندوستانی ساحلی علاقوں پر ایک طاقتور ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ وجود میں آیا، جس کے غیر ملکی تاجروں سے گہرے ... تھے اور وہ ان کے ساتھ تجارتی لین دین سے خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ مثال کے طور پر شروع ہی میں سورات میں اس طبقے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی، جس کا ذکر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات میں ملتا ہے۔"

آہستہ آہستہ برطانوی راج میں اس نئے سرمایہ دار طبقے نے اتنا اثر و رسوخ بڑھایا کہ برک کو برطانوی پارلیمان میں کہنا پڑا "بنیا، انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے۔ وہ تمام چالبازیوں، فریب کاریوں، اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظالم سے بچنے کے لئے ایک غلام استعمال کر سکتا ہے۔ بنیا لوٹتا ہے، استحصال کرتا ہے، غارت گری کرتا ہے اور پھر اس میں جس قدر مناسب سمجھتا ہے، اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر برباد کر دیئے ہیں، ملک برباد کر دیا ہے اور سرکاری مالیہ کو نقصان پہنچایا ہے۔" برک نے رام چند نامی ایک بنیئے کی مثال دی جو ساٹھ روپے کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ روپے کا ترکہ چھوڑا۔

ہندوؤں نے جدید تعلیم حاصل کی اور وہ حکومت اور سرکاری عہدے پر فائز ہوئے۔ ملکی سرمایہ داروں نے جن کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس بنائی۔

لیکن مسلمانوں نے نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ کبوتر بازی، بٹیر بازی اور "دوسری بازیوں" میں مصروف رہے، عظمت رفتہ کے خوابوں میں مگن مغلیہ کھنڈرات میں اپنے آباؤ اجداد کا جاہ و جلال اور اقدار تلاش کرتے رہے اور جب خواب غفلت سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ معاشرہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ ہندو نئے تقاضوں اور زمانے کا ساتھ دینے کی وجہ سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ سرکاری محکموں کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ہندو پہلے ہی مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ وال گلنی مشکل ہے۔ سیاست میں بھی بہت پیچھے ہیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن ایک کاہن نے ان کے کانوں میں یہ منتر پھونک دیا کہ "سیاست میں حصہ لینے کا وقت نہیں آیا۔ تم تعلیم میں پس ماندہ ہو۔"

کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے سرمایہ داروں اور برطانوی سامراج کے مفادات متصادم ہوئے۔ انڈین نیشنل کانفرنس نے، جو ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کی نمائندہ تھی، اُن کے مفادات کے تحفظ کے لئے جد و جہد شروع کی بی۔ جی۔ تلک نے کلکتہ میں انگریزوں کے خلاف تحریک چلائی بلوے ہوئے۔ کچھ انگریز بھی ہلاک ہوئے۔ ان حالات میں برطانوی حکمرانوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"، کی پالیسی پر عمل کیا۔ انہوں نے مسلمان نوابوں، جاگیرداروں، اور زمین داروں کو آگے بڑھایا۔ لارڈ کرزن نے انتظامی امور کی بنا پر بنگال کو تقسیم کیا۔ اس کا ایک مقصد بنگالی قومیت کے پکڑتے ہوئے جذبے کو کچلنا بھی تھی۔ لیکن تاثر یہ دیا کہ وہ مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کو ہندو بنگالیوں کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ بنگال کی تقسیم سے ہندوستان کے سرمایہ داروں کے مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ اس لئے کانگریس نے شدید مخالفت کی۔ لیکن لارڈ کرزن نے اس سیاسی اور انتظامی مسئلہ کو مذہبی رنگ دے دیا اور اسے ہندوؤں

اور مسلمانوں کا مسئلہ بنا دیا۔ نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ نے ابتداء میں تقسیم بنگال کی مخالفت کی۔ لیکن حکومت نے ایک لاکھ پونڈ کا قرضہ کم سود پر دے کر انہیں خرید لیا۔ جیب گرم ہونے کے بعد نواب سلیم اللہ قوم کے غم میں دبلے ہونے لگے۔ مسلمانوں کی حالتِ زار پر رحم آنے لگا اور وہ تقسیم بنگال کے سب سے بڑے حامی بن گئے۔

برطانوی حکمرانوں نے کانگریس کا زور توڑنے کیلئے مسلمان نوابوں اور جاگیرداروں کو سیاست میں حصّہ لینے کی شہ دی۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر آر۔ چیبولڈ نے نواب محسن الملک کو مشورہ دیا کہ وہ وائسرائے سے ملیں۔ چیبولڈ نے ہی ملاقات کا انتظام کرایا۔ مسلمانوں کے وفد کی سربراہی سر آغا خان کو، جن کی تاجِ برطانیہ سے وفاداری اور ہمدردی تعارف کی محتاج نہیں، سونپی گئی، ان دنوں سر آغا خان رنگون کے دورے پر تھے۔ وہ دورہ ملتوی کرکے ہندوستان آئے اور یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے سے ملے۔ نواب عماد الملک کی تحریر کردہ یاداشت وائسرائے کو پیش کی گئی۔ اس یاداشت میں جداگانہ انتخابات، اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر آبادی کے تناسب سے کچھ نشستوں، گزٹیڈ، نان گزٹیڈ، ہائی کورٹ، چیف کورٹ اور وائسرائے کی انتظامی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی اور مسلم یونیورسٹی کے قیام جیسے بے ضرر اور غیر سیاسی مطالبات کیے گئے۔ ان مطالبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوابوں اور جاگیرداروں کا وفد آزادئ وطن کے لئے نہیں بلکہ اپنے چند اقتصادی اور معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے وائسرائے سے ملا تھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی۔ اس اجلاس میں نواب سر سلیم اللہ نے مسلم لیگ کے قیام کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے کانگریس سے اختلاف کے یہ اسباب بیان کئے۔

"کانگریس سے ہمارے موجودہ اور آئندہ اختلافات کی بنیاد تین باتوں پر ہے۔ پہلی بات تو کانگریس کے وہ مطالبات ہیں جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کو خطرے میں ڈال رہے ہیں، دوسری بات ان مسائل کی ہے جو ہمارے جائز مفاد کیلئے مضر ثابت ہو رہے ہیں اور تیسری بات حکومت کے خلاف کانگریس کا جارحانہ رویہ ہے جو ہمیں پسند نہیں۔"

مسلم لیگ کے مقاصد کی پہلی شق یہ تھی "مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا اور حکومت کے اقدامات کے متعلق ان کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنا۔" نواب سلیم اللہ کی تقریر اور مسلم لیگ کے مقاصد سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کے قیام کا مقصد برطانوی نوآبادکاروں

چرچل نے کہا

میں برطانوی

حکومت کے زوال کیلئے

وزیرِاعظم نہیں بنا ہوں

کی حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنانا تھا۔ اور کانگریس سے اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس اُبھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقہ کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ جو برطانوی سرمایہ داروں کے مفادات سے بھی متصادم تھی۔ کیونکہ اُبھرتے ہوئے سرمایہ داروں کا اوّلین اور بنیادی فرض جاگیرداری اور زمین داری کو ختم کرنا ہوتا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اقتصادی اور معاشی مفاد کو مذہبی رنگ دیا اور اسلام کا مقدس نام استعمال کیا۔ لیکن جگہ جگہ اور ہر مرتبہ اس نے سمجھوتے بازی سے کام لیا۔ جداگانہ انتخابات کے طریقے کو مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے راہِ نجات قرار دیتی تھی۔ برطانوی حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم کیا، تو مسلم لیگ نے اسے اپنی بڑی کامیابی قرار دیا۔ لیکن معاہدہ لکھنؤ میں اس "کامیابی" کو اپنے مفادات پر قربان کر دیا۔ اور ایسا معاہدہ کیا جس کے ذریعے اکثریتی صوبوں کے مسلمان اقلیت میں بدل گئے لیکن جب مسلم لیگ کے نوابوں اور جاگیرداروں کے مفادات کانگریس کے سرمایہ داروں سے متصادم ہوئے تو ۱۹۲۸ء میں دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ جداگانہ طریقہ انتخاب کا مردہ دوبارہ زندہ کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں پھر سمجھوتہ ہوا۔ لیکن جب مسلم لیگ کو وزارت میں صرف ایک نشست کی پیش کش کی گئی۔ تو دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ اسی دوران کانگریسی حکومت نے "سونا چاندی" کی مارکیٹ سے واحد مسلمان سرمایہ دار سیٹھ حبیب کو نکال دیا۔ چنانچہ مسلمان سرمایہ داروں نے مسلم لیگ کے دامن میں پناہ لی۔ ان سرمایہ داروں کی شمولیت کی ایک وجہ یہ تھی کہ پنجاب مسلم لیگ نے اپنے منشور میں جاگیرداری اور زمین داری کے خاتمہ کی دفعہ شامل کی تھی۔ اس کے بعد ہی ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کی اور برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔

کانگریس اور مسلم لیگ آپس میں متصادم تھیں۔ کبھی سمجھوتہ کرتی تھیں۔ کبھی اختلاف، لیکن بین الاقوامی حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد دنیا میں ایک زبردست انقلابی لہر اٹھی۔ ۱۹۱۷ء میں دنیا کی پہلی پرولتاری حکومت سوویت یونین میں قائم ہوئی۔ جس کا اثر تمام غلام ملکوں پر پڑا۔ ۲۲-۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں عظیم الشان عوامی تحریکیں اٹھیں۔ جنہوں نے تاجِ برطانیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان سے بھی زیادہ شدید تحریکیں ۴۴-۱۹۳۰ء میں عالمگیر معاشی بحران کے بعد پیدا ہوئیں۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی قومی تحریک کو دبانے کے لئے یکے بعد دیگرے اصلاحات اور تشدد کے حربے استعمال کئے۔ دستوری مراعات کیساتھ ساتھ مستقبل میں سلف گورنمنٹ بنانے کا وعدہ کیا۔ لیکن یہ مراعات ایسی تھیں جن سے برطانوی تسلط اور اقتدار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان دستوری مراعات کی بنیاد پر ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے آٹھ صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم کی گئیں۔ لیکن عوام میں بے چینی بڑھتی رہی۔ جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ تو ہندوستان میں سامراجی

کانگریس حکومت نے سیٹھ حبیب کو سونا چاندی کی مارکیٹ سے باہر نکال دیا

مزدور تحریک نے
برطانوی حکومت کو
ہلا کر رکھ دیا

وفاقی دستور کے خلاف بڑا اُبال تھا جسے حکومت زبردستی مسلط کرنا چاہتی تھی۔ ہندوستان کو اس کی مرضی کے بغیر جنگ میں گھسیٹ لیا گیا۔ اور ایک ہنگامی جنگی آمریت قائم کر دی گئی۔

دوسری جنگِ عظیم نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ برطانوی حکومت آزادی کی باتیں کرنے لگی متحدہ اقوام نے اپنے مقاصد جنگ کا سرکاری طور پر جو اعلان کیا اس میں واضح طور پر کہا گیا کہ "ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے نظامِ حکومت کا انتخاب خود کرے"، جنگ کے بعد برطانوی حکومت نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ کیونکہ وزیر اعظم چرچل کا کہنا تھا کہ "میں برطانوی سلطنت کے زوال کا آلۂ کار بننے کے لئے وزیر اعظم نہیں بنا ہوں" لیکن جنگِ عظیم دوم نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اگر غلام ملکوں کو آزادی نہیں دی جاتی تو خونی انقلاب ناگزیر ہو جاتا۔ چنانچہ جان فاسٹر ڈلس اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جب دوسری جنگ میں قتل عام اور تباہ کاری اپنے آخری مرحلہ میں تھی تو سب سے بڑا سیاسی مسئلہ نوآبادیاتی مسئلہ تھا۔ اگر مغرب نے نوآبادیاتی نظام کو جوں کا توں قائم رکھنے کی کوشش کی ہوتی تو تشدد آمیز انقلاب ناگزیر ہو جاتا اور اس کے ساتھ ہی "مغرب" کی شکست بھی ناگزیر ہوتی۔ صرف ایک ہی پالیسی کامیاب ہوتی نظر آتی تھی اور وہ یہ کہ تیس کروڑ غلام افراد میں سے زیادہ ترقی یافتہ کو صلح کے ساتھ آزادی دے دی جاتی"۔ ("جنگ یا امن")

لیکن چرچل نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مزدوروں کی عظیم تحریک ابھری۔ عظیم الشان مظاہرے کئے گئے۔ اور آزادی ہند کا مطالبہ پورے ملک میں گونجنے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ قومی بغاوت کی چنگاریوں نے فوج کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور بحریہ نے بغاوت کر دی۔ دوسری جانب ان پالیسیوں کی وجہ سے چرچل حکومت کو انتخابات میں شکست کھانا پڑی۔ اور لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ جس کو پہلی بار برطانوی پارلیمان میں اتنی اکثریت نصیب ہوئی تھی۔ ہندوستان میں قومی بغاوت نے لیبر حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ جلد سے جلد انگریزی پالیسی میں تبدیلی کرے۔ چنانچہ ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو وزیر اعظم اٹیلی نے وزارتی مشن بھیجنے کا اعلان کیا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو مشن کی روانگی کے موقع پر مسٹر اٹیلی نے اعلان کیا۔

"پرانے وقت کے فارمولے کو نئے زمانے کے حالات پر منطبق کرنے کی کوشش بے سود ہے۔ ۱۹۴۶ء کا درجۂ حرارت ۱۹۲۰ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۲ء کے درجہ حرارت سے مختلف ہے۔ جنگِ عظیم سے زیادہ اور کوئی چیز رائے عامہ کی رفتار میں تیزی پیدا نہیں کرتی۔ دو جنگوں کے دوران جس کسی کو بھی اس سے سابقہ پڑا ہے وہ جانتا ہے کہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عظیم نے ہندوستانیوں کے خیالات اور انکی امنگوں پر کیا اثر ڈالا تھا، جو دھارا امن کے زمانے میں آہستہ آہستہ بہتا ہے وہ جنگ کے زمانے میں اور خصوصیت سے جنگ کے خاتمے پر بڑا تیز رفتار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دورانِ جنگ وہ دھارا ایک حد تک بندھا رہتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان اور سارے ایشیا میں قوم پرستی کا طوفان بڑی تیزی سے اُٹھ رہا ہے۔ ہندوستان کو خود اس کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ مستقبل میں اس کی حیثیت

14 اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتہ میں
پانچ ہزار افراد ہلاک ہوگئے

اور دنیا میں اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ خواہ وہ متحدہ اقوام کے ساتھ اتحاد کرے، خواہ دولتِ برطانیہ کے سائے میں رہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کوئی بڑی قوم تنہا نہیں رہ سکتی۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں اس کا حصہ لینا ضروری ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ ہندوستان دولتِ برطانیہ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں ہندوستان کی بھلائی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ اپنی آزاد رائے سے کرنا چاہیئے۔ کیونکہ دولتِ برطانیہ اور سلطنت برطانیہ کو بیرونی دباؤ اور زبردستی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا گیا ہے۔ یہ آزاد قوموں کا آزاد اتحاد ہے۔ اگر اس کے برعکس ہندوستان آزاد ہو جانے کا فیصلہ کر لے، ہمارے نزدیک اسے اس کا پورا حق ہے تو ہمارا فرض ہوگا کہ اختیارات کو انتہائی نرمی اور سہولت کے ساتھ منتقل کرنے میں مدد دیں"۔

یہ اعلان تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ پہلی مرتبہ برطانوی حکومت نے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ ہندوستان کی منزل "آزادی" ہے۔

لیکن وزارتی مشن نے ہندوستان آکر جس طرح کانگریس کو خوش کرنے اور اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے قلابازیاں کھائیں۔ وہ مسلم لیگ کے طبع نازک کو ناگوار گزریں۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کوئی سمجھوتہ کرنے کی بجائے عوام سے رجوع کیا، اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو "یوم راست اقدام" منایا۔ اس دن صرف کلکتہ میں پانچ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ سر فرانسس ٹکر (WHILE THE MEMORY SERVES) میں لکھتا ہے کہ "۱۶ اگست کو زبردست فسادات ہوئے۔ کلکتہ کی گلیوں اور سڑکوں میں لڑائی ہوئی، اور اس قدر افراد ہلاک ہوئے کہ ان کی لاشوں کو اوپر تلے مکانوں کی دیوار کے سہارے رکھا گیا"۔ مسلم لیگ نے قوت کا مظاہرہ کیا تو اسے عبوری حکومت میں نمائندگی دیدی گئی۔

لیاقت علی خان وزیر خزانہ مقرر ہوئے۔ انہوں نے صنعت تجارت پر بھاری ٹیکس نافذ کئے اور زراعت کے شعبہ پر ٹیکس نہیں لگایا۔ سرمایہ داروں کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس پر زور دیا کہ وہ برصغیر کی تقسیم منظور کرے اور مہاتما گاندھی کو جو یہ کہتے تھے کہ "برصغیر کی تقسیم میری لاش پر ہوگی" نے تقسیم ہند کی حمایت کی۔

باقی صفحہ ۲۸ پر

اظہارِ خیال

ادارے کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں
آپ بھی اس بحث میں حصّہ لے سکتے ہیں



پاکستانیوں پر
پاکستان کے
دروازے بند کرنے کی
سازش نہیں چلے گی

سیاسی اختلاف رائے کو غداری کا نام نہیں دیا جاسکتا

● ا۔ے۔ ٹی۔ رضوی ●

«بہاری» نہیں چاہئیں» کے عنوان سے امیر حسین شاہ کے خیالات دوسرے طبقے کی انتہاپسند سوچ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہر سطر میں منطق اور دلائل کی بجائے جذباتیت تعصب اور ضعیف الاعتقاد شخص کے اندیشوں کا رنگ غالب ہے۔ اندھے جذبات کے اُبال میں موصوف بعض ایسے جملے بھی لکھ گئے ہیں جس کی اجازت شاید دنیا کا کوئی اخلاق نہیں دے سکتا۔ آپ نے اس بحث کا دروازہ کھول کر اچھا کیا، عوام کو سیاسی اور علمی سطح پر دونوں مکتبۂ فکر کے خیالات سے آگاہ ہونے کا موقع ملے گا۔ لیکن اس بحث میں احتیاط اور آداب لازمی ہے۔ ہمارے یہاں بحث و مباحثہ اور دلائل کے ذریعے دوسروں کو قائل کرنے کی روایت ختم ہوتی جارہی ہے، اور اس کی جگہ گالی گلوچ، اور تشدد کا رجحان لے رہا ہے۔ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی کے بعض گوشوں میں اسی وجہ سے انارکی انتشار اور مستقبل سے مایوسی کی تیز و تند لہریں اٹھ رہی ہیں۔ اگر ہم نے اپنے مسائل تحمل، اور باہمی رواداری سے حل کرنے کا گر سیکھ لیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ایک باوقار قوم کی حیثیت سے ایشیا بلکہ دنیا میں پائیدار اور مستقل امن کے قیام میں تاریخی کردار ادا نہ کرسکیں۔

جب ہم جمہوری اقدار کی پاسداری کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ ہر شخص کو اختلاف رائے کا پورا حق پہنچتا ہے۔ اگر اس منطق کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ بنگلہ دیش میں مقیم غیر بنگالیوں نے (جنہیں بہاری کا نام دیا گیا ہے) شیخ مجیب کے چھ نکاتی فارمولے کا ساتھ نہ دے کر سیاسی غلطی کی تھی تو اس کے باوجود اُنہیں کسی صورت میں غدار یا بنگلہ دیش کا دشمن نہیں کہا جاسکتا ہے۔ جمہوریت میں ہر شہری کو اختلاف رائے کا حق دیا جاتا ہے۔ اگر غیر بنگالیوں نے چھ نکاتی تحریک کا ساتھ نہ دیا اور اس کی مخالفت کی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ انہوں نے اپنا سیاسی اور جمہوری حق استعمال کیا ہے جس کی اجازت دنیا کا ہر دستور اور ریاست دیتی آئی ہے۔ البتہ آمریت میں اس کا تصّور محال ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے مغربی پاکستان کی سیاست کو مثال بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے۔

انتخابات کے دوران مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے اُبھری، پیپلز پارٹی نے اپنے منشور میں عوام کو سوشلسٹ نظام دینے کا وعدہ کیا۔ بیشمار لوگوں نے اس کے پروگرام سے اختلاف کیا۔ انتخابات سے قبل، انتخابات کے دوران اور بعد میں ایسے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد مل جائیں گے جنہوں نے پیپلز پارٹی کے منشور کی کھُل کر مخالفت ہی نہیں کی بلکہ کام بھی کیا۔ کیا پیپلز پارٹی کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد اپنے سیاسی مخالفین کو "غدار"، اور ملک دشمن قرار دے کر پاکستان سے نکل جانے کا حکم دیدے۔ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ پیپلز پارٹی کو دنیا کے کسی بھی قانون کے تحت اس بات کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ اور پیپلز پارٹی کی حکومت نے ایسا کیا بھی نہیں۔ ٹھیک اسی طرح شیخ مجیب سے اختلاف رکھنے والوں کو بھی غدّار یا ملک دشمن قرار نہیں دیا جاسکتا۔

میں یہاں براہِ راست ایک سوال امیر حسین شاہ سے کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ سندھو دیش کی نام نہاد تحریک سے اختلاف رکھنے والوں کو غدّار اور سندھ دشمن قرار دیں گے۔؟ میرا خیال ہے آپ ایسا نہ کرسکیں گے۔ البتہ ایسے انتہاپسندوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی ملک دشمنی اور عوام دشمنی کو چھپانے کے لئے دوسروں کو غیر ملکی ایجنٹ اور غدار کا نام دیتے رہتے ہیں۔ شاہ جی میں آپ کا نام اس گروہ میں اس لئے شامل نہیں کروں گا کہ آپ نے بہاریوں کے بارے میں جو کچھ سوچا اس کو کاغذ پر منتقل کرکے عوام کے سامنے پیش کردیا۔ جن کے دل میں چور ہوتا ہے وہ اپنے خیالات کو سات پردوں میں چھُپا کر رکھتے ہیں۔ اور اندر ہی اندر دیمک کی طرح ملک کی جڑیں چاٹتے رہتے ہیں۔

بنگلہ دیش کے بہاریوں نے ملک کی سالمیت کے لئے قربانیاں دیں

صرف یہ بتانا ہے کہ بنگلہ دیش میں مقیم بہاریوں نے صرف شیخ مجیب سے سیاسی اختلاف کیا، جو ان کا جمہوری حق تھا لہٰذا اسے بنیاد بنا کر انہیں اسلام آباد کا ایجنٹ اور بنگلہ دیش کا غدار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اگر پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو آپ یہ بات محسوس کریں گے کہ یہاں ایسے عناصر موجود رہے ہیں جنہوں نے کبھی دل سے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے ہمیشہ ایسی تحریکوں کی اگوائی کی ہے جس سے ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچا اور قومی اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو۔ چونکہ عوام کی اکثریت ملک کی وفادار ہے اس لئے کم از کم مغربی پاکستان میں ایسی کوئی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ البتہ مشرقی پاکستان میں ہمارے حکمران ٹولے کی غلط سیاسی حکمتِ عملی، گروہی سیاست اور استحصالی نظام کی وجہ سے شیخ مجیب کی قیادت میں علیحدگی پسندی کی تحریک کامیاب ہو گئی۔ بنگالی عوام کی اکثریت چھ نکات کو اپنی نجات کا راستہ سمجھ کر شیخ مجیب کی سیاسی فریب کاری کا شکار ہو گئی۔ لیکن وہاں مقیم غیر بنگالیوں نے اصل صورتحال کو بھانپ لیا اور انہوں نے قومی اتحاد اور ملکی سالمیت کو اوّلیت دیتے ہوئے عوامی لیگ کے چھ نکاتی فارمولے کو ٹھکرا دیا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان بہاریوں کو محض اس لئے معتوب کیا جائے اور سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا جائے کہ انہوں نے ایک پاکستان کا نعرہ بلند کیا اور ملک کو بچانے کی جدوجہد کی۔ لازوال قربانیاں دیں۔ امیر حسین شاہ صاحب آپ نے بہت آسانی سے بہاریوں کو غدار قرار دے دیا، لیکن کیا آپ مغربی پاکستان میں ایسے لوگوں کو بھی "غدار" اور "ملک دشمن" قرار دیں گے۔ جو ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کسی سازش میں ساتھ نہ دیں گے۔ اور وہ ایک پاکستان کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیں گے۔ یہ عجیب نرالی منطق ہے کہ جن لوگوں نے پاکستان کی سالمیت کے لئے کام کیا۔ انہیں تو آپ غدار قرار دے رہے ہیں اور جن لوگوں نے ملک کی جغرافیائی وحدت کو پارہ پارہ کیا وہ آپ کے نزدیک ہیرو بن گئے۔؟

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ بنگلہ دیش میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے بہاریوں پر پاکستان کے دروازے بند کر دیئے جائیں یا کھول دیئے جائیں۔؟ امیر حسین شاہ اس بات کے خلاف ہیں کہ بہاریوں کو پاکستان لایا جائے۔ ان کے خیال میں چونکہ ان بہاریوں سے ایک پاکستان کے تحفظ کا "جرم" سرزد ہوا ہے اس لئے انہیں اپنے دکھوں کی آگ میں آپ جلنا چاہیئے میں امیر حسین اور ان کے مکتبہ فکر سے شدید اختلافات رکھتا ہوں اور اس بات کی پرزور حمایت کروں گا کہ چونکہ بنگلہ دیش میں مقیم بہاریوں نے جب پاکستان کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں اس پاکستان کے دروازے ان پر بند نہیں کئے جا سکتے۔ ان کا پاکستان پر اتنا ہی حق ہے جتنا امیر حسین یا دوسرے پاکستانیوں کا ہے۔ اگر پاکستان میں پاکستان کی خاطر جان دینے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے تو پھر پاکستان کا وجود بے معنی ہے۔

بہاریوں کے لئے ہمارا مجموعی قومی رویہ انتہائی افسوسناک اور بے حسی کا شکار ہے۔ ہم نوے ہزار فوجیوں کے لئے تو آنسو بہاتے ہیں جو اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران بھارت کے جنگی قیدی بن گئے، لیکن ہماری آنکھوں سے ان لوگوں کی ہمدردی میں ایک قطرہ بھی آنسو نہیں ٹپکا جنہوں نے ہر خوف اور لالچ سے بلند ہو کر وطن کی سالمیت کے لئے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا۔

میں حکومت پاکستان سے درخواست کروں گا کہ وہ ان بدنصیبوں پر پاکستان کے دروازے کھول دے۔ بقول مولانا بھاشانی، بہاری، محنتی، جفاکش، ذہین اور اپنی جگہ آپ بنانے والے ہوتے ہیں، وہ پاکستان کی معیشت پر بوجھ نہیں بنیں گے، بلکہ بنگلہ دیش کی طرح پاکستان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے میں نمایاں کردار ادا کریں گے۔ بلوچستان، سرحد، پنجاب اور سندھ، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور سندھیوں کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ تمام پاکستانیوں کے لئے ہیں۔ جو لوگ بلوچستان کو بلوچیوں، سرحد کو پٹھانوں، سندھ کو سندھیوں اور پنجاب کو پنجابیوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ علاقائی و گروہی سیاست اور تعصب کا شکار ہیں۔ ایک پاکستانی شہری کو اس بات کا پورا پورا حق پہنچتا ہے کہ وہ ان صوبوں میں اس کا جہاں جی چاہے رہائش اختیار کرے۔ بہاریوں کو ان تمام صوبوں میں تقسیم کر کے آباد کیا جائے۔ اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ وہ پاکستان کو ایک خوش حال، باوقار اور مضبوط بنانے میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔

بقیہ تحریک پاکستان

برطانوی حکمرانوں نے برصغیر کو تقسیم کر کے آزادی تو دے دی۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے جاتے جاتے بنگالی اور پنجابی قومیتوں پر ضرب کاری لگائی اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا تاکہ دونوں نو آزاد ممالک ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں اور اس خطہ کے عوام امن کا سانس نہ لے سکیں مسلم لیگ کے نوابوں اور جاگیرداروں کا کہنا تھا کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ہندوستان کی تقسیم چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دو قومی نظریہ کے حامی تھے۔ لیکن قائداعظم جو مسلم لیگ کے صدر اور بعد میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوئے، اس نظریہ کے حامی نہیں تھے۔ چنانچہ برسراقتدار آنے کے بعد پہلی تقریر میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے اسلامی ریاست اور دو قومی نظریہ کی نفی کر دی کہ "آپ آزاد ہیں۔ آپ کو اپنے مندروں میں جانے کی آزادی ہے۔ آپ کو آزادی ہے کہ اپنی مسجدوں میں جائیں یا پاکستان کے اندر کسی اور عبادت گاہ میں جائیں۔ آپ کا تعلق کسی مذہب، کسی ذات اور کسی عقیدے سے ہو، اس کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

خیبر سے کیماڑی تک
نوشیرو فیروز



وڈیرے ہاریوں پر ہنس رہے ہیں

—— علی احمد میمن

وڈیرہ شاہی کی کوکھ سے سیاسی بیداری جنم لے رہی ہے

صوبہ سندھ میں گیارہ اضلاع ہیں جن میں ضلع نواب شاہ زرعی پیداوار کے لحاظ سے پورے سندھ میں اپنا مقام رکھتا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سال حکومت کو سب سے زیادہ گندم ضلع نواب شاہ سے ملی ہے۔ لیکن اس ضلع میں وڈیرا شاہی اور نوکر شاہی کے ظلم کی وجہ سے ہاری نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس ضلع خصوصاً تحصیل نوشہرو فیروز کے ہاریوں میں وڈیرا شاہی کے مظالم کی وجہ سے سیاسی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور وہ وڈیرا شاہی کا غرور مٹی میں ملانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

یوں تو گذشتہ پانچ سالوں میں اس تحصیل میں کافی چھوٹے موٹے معرکے وڈیرا شاہی، نوکر شاہی اور ہاریوں کے درمیان ہو چکے ہیں لیکن سب سے بڑے معرکے دیہہ گچھ اور دیہہ بھرنڈ میں ہوئے ہیں۔ ہاریوں نے اپنی تحریک کا آغاز سال ۱۹۶۹ء میں ایک کلیمنٹ فتح محمد پٹھان سے کیا تھا۔ ہاریوں کا مطالبہ تھا کہ ٹیننسی ایکٹ جو کہ وڈیرا شاہی کے نمائندوں نے بحال کروایا تھا جس کی رو سے زمیندار کو کپاس کی چنائی کی آدھی رقم ہاری کو دینی ہے لیکن دی نہیں جاتی۔ وڈیروں نے جب دیکھا کہ یہ معاملہ لمبا ہو رہا ہے تو فتح محمد صاحب نے دوسرے وڈیروں کا سہارا لیا اور معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا کہ ہاری بغاوت پر آمادہ ہیں اور اسے ایک مہاجر سمجھ کر اس کی پیداوار ہضم کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال ہاریوں نے اپنے اتحاد کے اصول پر فتح محمد اور دیگر وڈیروں سے تقریباً تین لاکھ روپیہ کپاس کی چنائی وصول کر لی۔ اس کامیابی کے بعد ہاریوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔

چند دنوں کے بعد دیہہ گچھ میں سینکڑوں ایکڑ دریا خورد زرعی اراضی جس پر غمیسو، محمد صالح ملاح، اللہ بخش گوراھو اور دیگر ہاری صدیوں سے آباد تھے۔ وہاں کے ایک مقامی گوراھو زمین دار کی نشاندھی پر مسمات امان بی بی، بیگم ہر ہائینس نواب جونا گڑھ نے اپنے کلیم پر الاٹ کروا لیا جو کہ بعد میں اس گوراھو زمیندار نے خرید لیا۔ اس وڈیرے نے جیسے ہی زمین خریدی اس نے وہاں کے صدیوں پرانے ہاریوں کو فوری بیدخل کرنے کا آغاز کیا۔ جس پر ہاریوں نے احتجاج کیا۔ وڈیرے نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور دوسری طرف ان پر اپنے کرائے کے مسلح غنڈوں کے ذریعے سخت سردی اور برسات میں غریب ہاریوں پر فائرنگ کروا کر زبردستی بیدخل کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہاریوں پر ڈکیتی، اقدام قتل اور دیگر کئی مقدمے دائر کروا کر تمام مردوں کو جیل بھیج دیا اور پیچھے ان کی عورتوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا اور ان کے گھروں میں پڑا سامان ان غنڈوں کے حوالے کر دیا اور خالی گھروں کو آگ لگوا دی گئی تاکہ یہ جواز پیدا کیا جا سکے کہ یہ ہاری اس زمین کے ہاری نہیں اور ان کا یہاں کوئی مکان نہیں ہے۔ اتنے تشدد کرنے کے باوجود بھی وڈیروں کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ تو انہوں نے جیل حکام سے ساز باز کر کے جیل کے اندر بھی ان ہاریوں پر ظلم کرائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جیل کے اندر ہاریوں نے سخت احتجاج کیا اور جیل کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ پورے ضلع کی پولیس مسلح ہو کر ہاریوں کی زبان بند کروانے پر تل گئی۔ اور ایک شام کو ان پر اندھا دھند آنسو گیس اور گولیوں کی بارش کر دی۔ لوگ حیران تھے کہ آخر ان غریب ہاریوں کا کیا قصور ہے؟ عوامی کارکنوں نے شہر کے سب سے بڑے چوک پر ہاریوں کی حمایت میں ایک جلسہ کیا۔ شہر میں جلوس نکالے گئے۔ بھوک ہڑتالیں ہوئیں لیکن غریبوں کی کون سنتا ہے۔ آج بھی یہ ہاری تقریباً دو سال سے در در کی خاک چھان رہے ہیں۔ ہاریوں کے خلاف مقدمات چل رہے ہیں۔ اور وڈیرے آج بھی اپنے بنگلوں میں آرام سے بیٹھے ہوئے ہاریوں کی نادانی پر ہنس رہے ہیں۔

حال ہی میں حکومت سندھ کے ہوم سیکرٹری نوشہرو فیروز آئے تو ہاریوں نے ان کو بتایا کہ اس دیہہ میں سینکڑوں ایکڑ دریا خورد زمین ہے جو کہ زمیندار نے اپنے زمین کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ اس کا لگان بھی حکومت کو ادا نہیں کرتا اور حکومت کو ہزاروں روپے کا نقصان پہنچا رہا ہے۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ یہ معاملہ بہت سنگین ہے اور اس کا فیصلہ وزیر اعلیٰ کریں گے۔

ہاریوں کی تحریک کا دوسرا بڑا اور اہم واقعہ دیہہ بھرنڈ میں ہوا ہے، جو ابھی تک چل رہا ہے۔

ان ہاریوں کے پاس جو زمین ہے وہ بھی کراچی کے ایک کلیمنٹ مسمات مسیح النساء زوجہ ڈاکٹر قطب الدین احمد کی ہے۔ ان مسمات کو ۶۴ ایکڑ مستقل سٹلمنٹ اسکیم کے تحت اور ۴۰۰ء۱۵ ایکڑ سرینڈر کلیم کے تحت ملی ہوئی ہے، یعنی ان کی کل ۴۰ء۱۶ ایکڑ کا رقبہ دیا گیا۔ کچھ عرصہ تو اس رقبے کو ڈاکٹر خود آباد کرواتا رہا، لیکن بعد میں اس نے یہ زمین ایک بہت بڑے وڈیرے عبدالرحیم کلہوڑو کو ٹھیکے پر پانچ سال کے لئے دیدی۔ جبکہ ہاریوں نے بھی اس بھاؤ پر ٹھیکہ لینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کلہوڑو چار سال کے بعد زمین کو ہاریوں کے حوالے کر کے نو دو گیارہ ہو گیا۔ اس کے بعد ایک اور صاحب بنام رتا خان پنہور نے ٹھیکیدار ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن ہاریوں میں سیاسی وہ سیاسی شعور دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ کر اپنے گھر کو واپس چلا گیا۔ اس کے بعد پھر ایک حضرت بنام اعجاز علی میمن نے دعویٰ کیا کہ وہ اس زمین کا ٹھیکیدار ہے۔ لیکن وہ بھی اپنے ہی جال میں ایسا پھنسا کہ آخر مجبور ہو کر اسے ہاریوں سے معافی مانگنی پڑی۔

اور پھر کبھی اس نے زمین کی طرف رُخ نہیں کیا۔ مارچ ۷۳ء میں حاجی فیض محمد اور حاجی عبدالطیف بہنوز سامنے آئے ہیں۔ حاجی فیض محمد نے جو ایڈیشنل ایس پی جناب محمد محسن کے والد ہیں، مسمات مسیح النساء کا مختیار عام ہونے کا دعویٰ کیا، جبکہ مسیح النساء کے بیٹے کے مطابق حاجی فیض محمد، حاجی عبدالطیف اور دیگر حضرات اس زمین کے خریدار ہیں۔ ویسے اتنا یہ بھی معلوم ہوا کہ مسیح النساء نے اپنی زمین کا زائد رقبہ زرعی اصلاحات سے بچانے کی خاطر تمام رقبے کو اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کو بخش چکی ہیں۔ جبکہ مذکورہ بخشش کو سندھ لینڈ کمیشن نے نامنظور کر دیا ہے۔

حاجی فیض محمد نے جناب عبداللہ بھٹی مختیار کار نوشہرو فیروز نے عدالت میں درخواست دی کہ ہاری زمینداری بٹائی حصے لے گئے ہیں۔ دوسری طرف ہاریوں نے بھی اس عدالت میں درخواست دیدی کہ کلیمنٹ مسیح النساء حاجی فیض محمد، حاجی عبدالطیف اور دیگر لوگوں کے خلاف مارشل لاء ضابطہ ۱۱۵ کے تحت کارروائی کی جائے۔ عدالت نے ہاریوں کے حق میں فیصلہ دیا تو فیض محمد اور حاجی عبدالطیف اور ان کے حواریوں نے عملہ آبپاشی سے سازباز کر کے پانی روکنے کی کوشش کی جو ناکام بنادی گئی۔

حال ہی میں ہوم سیکرٹری نوشہرو فیروز آئے تو ہاریوں نے ان سے تفصیلی ملاقات کی، اور حالات بتائے، جس پر حاجی فیض محمد، حاجی عبدالطیف، مسٹر محمد محسن کے خلاف مارشل لاء کے ضابطہ نمبر ۱۱۵ کی دفعہ ۳۰ اور ۳۱ کے تحت کارروائی کرنے کا حکم دیا گیا، جسے مختیار کار نے اپنے نمبر ۲۰۰۶-۵ مورخہ ۲۴ جولائی ۷۳ء کے تحت پولیس نوشہرو فیروز کو ضروری کارروائی کرنے کا تحریری حکم دیا، لیکن تادم تحریر پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ حاجی فیض محمد، حاجی عبدالطیف گرفتاری سے پہلے ضمانت کروانے کی کوشش کر رہے ہیں اور محمد محسن ان کی مدد کر رہا ہے۔

راولپنڈی

راحت وولن ملز کا سیٹھ اپنا سرمایہ بیرون ملک منتقل کر رہا ہے



عالم زیب مکروزئی

تاریخ شاہد ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت قائم ہونے والی ہر حکومت اپنے آقا سرمایہ دار کی خوشنودی اور اس کے مفادات کے تحفظ کے لئے اپنا تن من دھن نچھاور کئے رکھتی ہے۔ حکومت کے کردار کا عکس ان قوانین سے صاف جھلکتا نظر آتا ہے، جو وہ "عدل وانصاف" کے نام پر وضع کرتی ہے۔ اور ماتحت اداروں کا کردار اس طریق کار سے ظاہر ہوتا ہے جو وہ ان قوانین پر عملدرآمد کرتے وقت ادا کرتے ہیں۔ حکومت نے محنت (لیبر) کے قوانین بنائے تاکہ صنعتی امن بحال رہے۔ پیداوار میں اضافہ ہو، مزدور خوشحال ہوں، یہ تمام وہ اصطلاحات ہیں جو سرمایہ دار، اس کی حکومت اور اس کے ادارے جو "امن وامان" برقرار رکھنے پر مامور کئے جاتے ہیں۔ آئے دن مزدوروں کی زیادتیاں باور کرانے کے لئے الاپتے رہتے ہیں۔

صنعتی امن ہمیشہ اس وقت برباد ہونے کا شور مچایا جاتا ہے جب مزدور اپنے سلب کئے ہوئے حقوق کی بحالی کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔ اور سرمایہ دار کی غاصبانہ روش کے خلاف جدوجہد کا عہد کرتے ہیں۔ جہاں تک پیداوار میں اضافے کا تعلق ہے، مزدور تو ہمیشہ اپنی اُجرت کی نسبت کہیں زیادہ پیداوار کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو کوئی بھی سرمایہ دار اندھا دھند دولت نہیں سمیٹ سکتا۔ "مزدور کی خوشحالی" کا نعرہ در اصل وہ خوش فہمی ہے جس میں سرمایہ دار مزدور کو مبتلا کر کے اپنے نظام کو قائم ودائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس خوشحالی سے حقیقی مراد سرمایہ دار کی اپنی خوش حالی ہے۔

یوں تو ملک کے تمام صنعتی اداروں کی طرح راولپنڈی کے تمام اداروں میں بھی "صنعتی امن" پیداوار میں اضافہ، اور مزدوروں کی خوشحالی کے ڈونگرے وقتاً فوقتاً برسائے جاتے ہیں لیکن راحت وولن ملز کے بدعنوان مالک شمس الدین نے گزشتہ تین سال کے دوران صنعتی امن کے نام پر حکومت اور اس کے پٹھو اداروں کی اعانت سے مزدور دشمنی کا جو بازار گرم کر رکھا ہے، اس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں شاذ ہی ہو۔

شمس الدین نے اپنے وحشیانہ مظالم کا آغاز انتہائی بھیانک طریقے سے اس وقت شروع کیا جب مئی ۱۹۷۰ء میں اس نے دس مزدوروں کو غیر قانونی طریقے سے نکال دیا۔ یونین نے احتجاج کیا تو سخت قسم کی دھمکیاں ملیں چند مزدوروں نے مل کے گیٹ پر بھوک ہڑتال کر ڈالی۔ مالک تو کجا حکومت اور مقامی انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس دوران بھوک ہڑتالی مزدوروں میں سے ایک مزدور نور عبداللہ نے مل کے گیٹ پر تڑپ تڑپ کر ۹ مئی ۷۰ء کو جان دیدی۔ برصغیر کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک بھوک ہڑتالی نے اپنی مرن برت کا عہد پورا کر دکھایا، مگر اس پر شمس الدین کے خلاف تادیبی کارروائی تو کیا اُلٹا مقامی حکام نے دوستی کی پینگیں اس قدر بڑھائیں کہ گزشتہ تین سال کے دوران اس نے بڑے آرام سے ۹۰۰ میں سے ۵۰۰ مزدوروں کو برطرف کر دیا۔ اب مزید ایک سو کے قریب زیر عتاب ہیں۔ اس لئے کہ ڈی۔ ایس۔ پی کینٹ سرکار چوہدری سے سیٹھ شمس الدین کی گاڑھی چھنتی ہے۔ چوہدری جی کی اعانت یا ذہانت سے وہ اپنے راولپنڈی کے تمام اثاثے بیچ کر یہاں کے صرافہ بازار سے جتنا سونا خریدتا ہے، اُسے طورخم کی سرحد کے پار بے کھٹکے پہنچا دیا جاتا ہے۔ شمس الدین نے بھی اپنا تمام سرمایہ افغانستان منتقل کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے اس لئے وہ آئے دن خام مال نہ ہونے کا جواز بنا کر کوئی کھاتہ بند کر دیتا ہے۔ اس کھاتے کے مزدوروں کو برطرف کرنے کے بعد مشینری بیچ دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنا تمام سرمایہ

افغانستان منتقل کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں ذرہ بھر بھی دقت محسوس نہیں کرتا۔ محکمہ محنت کو اس کی اس خلاف قانون روش پر مزدور معترض ہونا چاہیئے۔ مگر اس کی تجوریوں میں بھرے ہیروں اور سونے کی چمک نے یہاں کے ڈپٹی ڈائریکٹر لیبر کی آنکھوں کو چندھیا کے رکھ دیا ہے۔ آئے دن ان کی تواضع ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل اور سلوگرل میں کی جاتی ہے۔ اگر محکمہ محنت کے کسی افسر کو غلطی سے ضمیر کا خمیر لگ جائے تو یہاں کی افسر شاہی سے گٹھ جوڑ کر کے اسے انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یا اس کے احکامات پر عمل درآمد کو پولیس کی مداخلت سے بے اثر کر دیا جاتا ہے۔ یہاں پر ایک قابل ذکر اسسٹنٹ ڈائریکٹر لیبر چوہدری محمد شفیع تھے، جنہوں نے سیٹھ شمس الدین کی قانون شکنی پر پانچ سو اٹھانوے چالان کئے تھے۔ مگر مقامی عدالت نے صرف ۹۸ چالانوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے صرف تین روپے فی چالان جرمانہ کیا۔ ادھر چوہدری محمد شفیع پر ان کی ترقی روک دی گئی، اور انہیں رحیم یار خان تبدیل کر دیا گیا۔

سیٹھ شمس الدین اور مقامی انتظامیہ کے سانجھے کے تشدد کے ساتھ ساتھ راحت وولن ملز کے جیالے مزدوروں کا اجتماعی شعور بھی اسی شدت سے ابھرا ہے۔ وہ پیپلز لیبر فرنٹ کے زیر قیادت گزشتہ تین سال سے مسلسل اپنے خلاف ہونے والے ہر ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی پرعزم جدوجہد سے راولپنڈی بھر کے محنت کش ساتھیوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا ہے۔ راحت وولن ملز کے کارکنوں نے اپنی یونین کے رہنماؤں کی زیر قیادت اپنی صفوں میں اتحاد و تنظیم کی اور بے پناہ قوت مجتمع کر لی ہے۔ پیپلز لیبر فرنٹ سے ملحقہ تمام یونینوں نے راحت وولن ملز کے جیالے محنت کشوں کی پرعزم جدوجہد کی صداقت پر کامل یقین کیا ہے۔ اور وہ عہد کئے ہوئے ہیں کہ راحت وولن ملز کے مزدور دشمن و ملک دشمن سرمایہ دار سیٹھ شمس الدین کو ملز کے اثاثے بیچ کر سینکڑوں مزدوروں کو بے روزگار کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ راحت وولن ملز کے ہر پرزے کو مزدوروں نے سالہا سال اپنے خون سے سینچا ہے۔

بقیہ احوال واقعی

وہ اجرتوں کی شرح بھی اسی تناسب سے مقرر کرے۔ ہمارے خیال میں اجرتوں میں اضافہ سے مہنگائی کا بوجھ کم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنے اور تجربے میں یہی آیا ہے کہ گرانی میں اضافے کی رفتار تنخواہوں میں اضافہ سے کئی گنا زیادہ رہتی ہے۔ ہمارے وزیر خزانہ "سوشلسٹ" ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ مغرب کی بجائے چین کی طرف دیکھیں اور ان اسباب کا جائزہ لیں جس کی وجہ سے چین میں قیمتوں میں اضافہ کی بجائے کمی کا رجحان ہے۔

حکومت قیمتوں میں کیوں اضافہ کر رہی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کے دو اسباب ہیں۔ موجودہ حکومت وڈیروں اور بڑے زمینداروں پر مشتمل ہے۔ انہیں اپنا مفاد عزیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ بھی زراعت پر ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ گندم، چاول، کپاس کے نرخوں میں اضافہ کر کے وڈیروں اور بڑے زمین داروں کو اپنی تجوریاں بھرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں۔ ورنہ حکومت کے اس دعویٰ کے پیش نظر کہ اس سال گندم، چاول اور کپاس کی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ قیمتوں کے اضافے کا کوئی جواز نہیں۔ اس کے علاوہ اسمگلنگ، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی اپنے شباب پر ہونے کی وجہ سے نرخوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

وڈیروں اور زمینداروں کے علاوہ حکومت سرمایہ داروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس لئے بناسپتی گھی کی قیمت میں اضافہ کیا گیا اور انہیں ایک سیر بناسپتی گھی پر ایک روپیہ پچاس پیسے منافع کمانے کی اجازت دی گئی، جس کا خود حکومت نے اعتراف کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے خیال میں سرمایہ داروں کو اس سے بھی زیادہ منافع ملتا ہے۔ بناسپتی گھی میں جو سب سے گراں چیز استعمال ہوتی ہے وہ سویابین کا تیل ہے۔ یہ تیل سرمایہ داروں کو ۱۱۵ روپے فی من کے حساب سے فراہم کیا جاتا ہے۔ بناسپتی گھی میں سویابین کے تیل کی آمیزش زیادہ سے زیادہ تیس فیصد ہوتی ہے۔ باقی بنولے وغیرہ کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملز مالکان کو ایک سیر بناسپتی گھی پر ڈیڑھ روپے سے بھی زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔

بقیہ ڈاکٹروں کی لاپرواہی

خدمت اور دلجوئی کے لئے وقف کر دی تھی۔

کراچی میں ایسے حادثات روزانہ ہوتے ہیں، ایک آدمی کی موت سے پورا کنبہ اجڑ جاتا ہے۔ لیکن ان میں ایسے واقعات کہیں زیادہ افسوسناک اور عبرت انگیز ہوتے ہیں جن میں کچھ لوگ ذمہ دار افراد کی غفلت کے سبب انسانی کنبوں پر موت اپنا بھیانک سایہ پھیلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ نور خان دوسرے سینکڑوں افراد کی طرح کراچی کی سڑکوں پر حادثہ کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن گیا۔ بلاشبہ اس کی موت ایک دردناک واقعہ ہے، لیکن ہسپتال میں جس انداز سے اس کا ٹریٹمنٹ کیا گیا وہ ہمارے سرکاری ہسپتالوں کی گھٹیا اور بے ہودہ کارکردگی کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے۔ نہ جانے ایسے کتنے افراد ڈاکٹروں کی لاپرواہی اور غفلت کا شکار بنتے ہوں گے، اور کتنی انسانی زندگیاں روزانہ پامال ہوتی ہوں گی ——— ؟

متوفی نور خان کے سالے صغیر خان کا بیان ہے کہ وہ نور خان کے علاج سے مطمئن نہ تھا۔ ایک شخص جو ہوش و حواس میں تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ معمولی چوٹیں آئی ہیں آخر وہ کس طرح موت کے منہ میں چلا گیا۔ اگر ڈاکٹر چار بجے سے لیکر رات کے دس بجے تک نور خان پر پوری توجہ دیتے تو ممکن تھا کہ وہ بچ جاتا۔ ویسے موت و حیات تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر بھی انسان اپنی حد تک پوری کوشش کرتا ہے۔ صغیر خان بعض ڈاکٹروں کی فرض شناسی اور خلوص سے متاثر ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ہسپتالوں کے موجودہ حالات اور کارکردگی سے مایوس ہوا ہے۔ ہم تمام ڈاکٹروں کو غیر ذمہ دار اور فرض ناشناس نہیں ٹھہراتے، لیکن ایسے بدعنوان اور سنگ صفت ڈاکٹروں کی بھی کمی نہیں ہے، جو ڈیوٹی کے دوران اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور اپنا زیادہ وقت بند کیوارٹروں کے اندر سرگوشیوں میں گزارتے ہیں۔

آخر سرکاری ہسپتالوں سے بدعنوانی، لاپرواہی اور فرض ناشناسی کا ماحول کب ختم ہوگا۔ مریض یہ کب محسوس کریگا کہ وہ کسی مذبح خانے میں نہیں بلکہ مسیحا کے گھر آیا ہے۔

Weekly "Al - Fatah" Karachi
16-23 AUGUST, 1973



ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۲۲۔ اگست ۱۹۷۳ء کو

جنگی قیدی نمبر
شائع کر رہا ہے

□ زیڈ اے بھٹو □ بیگم نصرت بھٹو □ معراج محمد خان □ جنرل ٹکا خان
□ ایئر مارشل ظفر چودھری ، ایڈمرل ایچ۔ ایچ۔ حسن

لکھنے والے

حضرت جوش ملیح آبادی۔ فیض احمد فیض۔ احمد ندیم قاسمی۔ امرتا پریتم۔ عبدالحمید عدم
شوکت صدیقی۔ قدرت اللہ شہاب۔ جمیل الدین عالی۔ منہاج برنا۔ خالد علیگ
فارغ بخاری۔ اقبال میر۔ قتیل شفائی، احمد فراز۔ فہمیدہ ریاض۔ کیپٹن آصف،
حسن عابدی۔ نصر اللہ خاں۔ اور ارشاد احمد خان

- جنرل نیازی اور دوسرے جنگی قیدیوں کے مکتوب
- جنگی قیدیوں پر کیا گزری
- سقوط ڈھاکہ کے اسباب۔ ایک جائزہ

صفحات ۶۸ ○ قیمت ۱ روپیہ ○ رنگین ٹائیٹل ○ درآمد شدہ سفید کاغذ

ایجنٹ حضرات ۱۸۔ اگست تک مطلوبہ تعداد سے مطلع کریں

مشتہر حضرات ۱۸۔ اگست تک جگہ محفوظ کروالیں

جنرل منیجر: ہفت روزہ الفتح ۸۷۔ ڈی کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس کراچی، فون ۴۱۲۲۷۴